حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب
از
اقبال جہاں قدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب

از

اقبال جہاں قدیر

تاریخ اشاعت — فروری ۱۹۸۵ء

تعداد ″ — ۲۰۰۰ ہزار

مطبع — ملکی پریس چھتہ بازار حیدرآباد

کاتب — محمد بشیر الدین

تصاویر — محکمہ معلومات عامہ حکومت اندھرا پردیش

بلاکس — محمد شرافت اللہ

فیمس بلاک منڈی میر عالم

بلاک پرنٹنگ — مظہر السلام پریس چھتہ بازار

قیمت — (۳۰) روپیہ (تیس روپیہ)

ــــــ ملنے کے پتے ــــــ

۱۔ الیاس بک ٹریڈرس

بک ڈپو : شاہ علی بنڈہ حیدرآباد

۲۔ اُردو آرٹس کالج ۔ حمایت نگر ۔

مصنف کے پتے پر مکان نمبر ۱۷ - ۶ - ۹۳

نزد الاوہ بی بی، دبیر پورہ

حیدرآباد (۴)

ترتیب

تعارف

زیر نظر کتاب "حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب" کی مُصنفہ محترمہ اقبال جہاں قدیر (ساجدہ) زوجۂ محمد یوسف علی صاحب ایک علم دوست اور مذہبی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں ان کے جدِ اعلیٰ حافظ محمد معروف برہان پوری جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے، موصل سے ہندوستان کے علاقے برہان پور میں آئے اور وہاں سے نواب والاجاہ کے عہد حکومت میں وارد مدراس ہوئے۔ حضرت معروفؒ کے ایک فرزند نواب عارف الدین خاں رونق المخاطب مظفر جنگ فارسی کے صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں جو کنجی رام کے تعلقدار تھے، وہ اپنے وقت کے بڑے پایے کے عالم اور خوش نویس تھے رونق کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا ان کے حالات گلزار اعظم، گلدستۂ کرناٹک مولفہ علی رضا، تذکرۂ شاعراں مولفہ عبدالعلی والہ، تذکرۂ صبح دکن تاریخ برہان پور، فیوضات فدائی از مظفر الدین خاں صاحب حیدرآبادی میں ملتے ہیں رونق کے بڑے فرزند زین العابدین خاں راجا چندو لال شاداںؔ کے عہد میں ورنگل کے تعلقدار رہے رونق کے دوسرے فرزند مولوی مہدی واصف فارسی کے صاحب دیوان شاعر اور مدراس کے مشاعروں کے روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ رونق کے اور دو فرزند حافظ مولوی حمید الدین اور حافظ رشید الدین اپنے

دور کے بہترین خوشنویسوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

نواب زین العابدین خان کے بڑے فرزند حضرت معروف علی شاہ فدآئی صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں جو اپنے وقت کے عالی مرتبت دینی بزرگ گزرے ہیں جن کے لڑکے حضرت ہدایت محی الدین خاں فدآئی ناظم دارالقضا حیدرآباد رہے۔ اس کے بعد ناظم اول حقیقہ بلدہ و ناظم اول دیوانی بلدہ رہے وہ صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ حضرت معروف علی شاہ فدآ کے دو لڑکے زین العابدین خاں عرف چنو نواب اور پاشا محی الدین خاں مقتول تھے حضرت مقتول کے فرزند مظفر الدین خاں صاحب حیدرآبادی ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن پر قلم اٹھایا ہے۔

مہدی واصف کے دو لڑکے حکیم عبدالباسط عشق اور مولوی عبدالعلی والہ دونوں بڑے محقق اور بلند پایہ شاعر تھے۔ عشق فارسی عربی کے علاوہ انگریزی کے بھی بڑے ماہر تھے جو ڈاکٹری اور سرجری کے فن میں ید طولی رکھتے تھے انھوں نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ عشق کے ایک فرزند مولوی عبدالحی وصف تاریخ گوئی کے فن میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے اقبال جہاں قدر کے اجداد میں رونق اور مہدی واصف کے بعد عشق کے دوسرے فرزند ملا عبدالقیوم تعلقدار کا نام قابل ذکر ہے جو دائرۃ المعارف کے اولین معمار اور بہترین مقرر اور شاعر تھے۔ ان کے فرزند جسٹس ملا عبدالباسط صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ترانۂ عشق، دیوان رونق اور دیوان وصف چھپوانے کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ اور کئی کتابیں لکھیں۔

عشق کے اور ایک نواسے مولوی عبدالرب تحصیلدار تھے جن کے پانچ لڑکوں میں مولوی عبدالحق صاحب، مولوی عنایت علی صاحب، ملا عبدالقیوم صاحب، مہدی علی صاحب اور نورالحق صاحب میں تین یعنی نورالحق صاحب ایچ سی ایس مہدی علی صاحب ایچ سی ایس اور ملا عبدالقیوم صاحب ایچ سی ایس ہوئے۔

ملا عبدالقیوم صاحب سابق ناظم دارالطبع ہیں۔ آپ نہایت متین، سنجیدہ مزاج اور قابل انسان ہیں آپ کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ مولوی عنایت علی صاحب ایک مذہبی اور خدا پرست انسان ہیں جو قوم کی خاموش خدمت میں ہر وقت منہمک رہتے ہیں۔

مولوی عبدالعلی والہ کو فارسی عربی ادب اور شاعری میں خاصی دستگاہ تھی۔ دارالعلوم میں مدرسی کی اور نظام کالج میں فارسی و عربی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ والہ مرحوم اکثر مشاہیر حیدرآباد کے اُستاد رہے ان کے ایک اور بھائی مولوی عبدالعزیز صاحب نے تاریخ عزیز دکن" لکھی۔ ان اور ایک بھائی مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے بیٹے نواب قادر نواز جنگ صوبہ دار نے علم تصوف پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی دختر نجم النسا بیگم پیشہ تدریس سے وابستہ ہیں۔

مولوی عبدالواجد اور حافظ محمد عبدالولی دونوں حضرات والہ کے فرزند تھے مولوی عبدالولی صاحب کے فرزند مولوی عبدالقدیر صاحب خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شفیق اور ہر دل العزیز استاد بھی تھے جن کے متعدد شاگرد حیدرآباد میں موجود ہیں ان کے ایک بھانجے سید احمد حسینی سابق منتظم مالگذاری سید کلان حسینی دیسمکھ منگول کے صاحبزادے ہیں جن کی چھوٹی بہن عائشہ صدیقہ

والدہ حامد سلطان وزیر سلطان کی بہو ہیں۔ مولوی عبدالقدیر صاحب کی والدہ عفت النساء بیگم صاحبہ کے نانا حضرت بڈھن علی شاہ عرف گلگٹ سید صاحب صوفی بزرگ گزرے ہیں جو میر میراں اشرف حسینی وزیر اعظم ٹیپو سلطان کے بیٹے تھے۔ میسور کی جامع مسجد میں انکا مزار ہے۔

اقبال جہاں قدیر کی والدہ رشید النساء بیگم محمد اسمٰعیل کمندان کی صاحبزادی ہیں اور محمد اسحاق صاحب کی حقیقی ہمشیر ہیں اور نواب میر احمد علی خاں، یم اے یل یل بی سابق وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش کی پھوپھی زاد بہن ہیں نواب صاحب موصوف کی علم دوست شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ حیدرآباد کے امیر وکبیر نواب اللہ یار خاں کے پوتے نواب میر واجد علی خان کے صاحبزادے اور ڈاکٹر سعید جنگ نیاض الدولہ کے نواسے ہیں۔ آپ برحق سادات ہیں نسیم صمدانی رشید النسا بیگم کی ایک بھانجی زوجہ محمد علی زیرک نے حیدرآبادی دسترخوان کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جنکے برادر شرف الدین خان بقا کی بیوی نظام شاہ بیگم حیدرآباد ماڈل اسکول میں اردو ٹیچر ہیں۔

اقبال جہاں کے رشتہ کے نانا تاج الدین تاج قریشی نے حیدرآباد کی منظوم تاریخ لکھی تھی جو ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔

مولوی عبدالقدیر صاحب نے اپنی لڑکیوں کو مذہبی تعلیم کے علاوہ جدید تعلیم بھی دلوائی ان کی بڑی لڑکی ڈاکٹر قمر جہاں زوجہ ڈاکٹر سید اکرام الدین تیسری لڑکی زاہدہ قدیر زوجہ ڈاکٹر مقبول حسین قریشی اور سب سے چھوٹی لڑکی ڈاکٹر سعیدہ قدیر زوجہ ڈاکٹر بشیر احمد ابھی امریکہ میں مقیم ہیں۔

مولوی محمد عبدالقدیر صاحب قدیرؔ حیدرآبادی

سنہ وفات	سنہ ولادت
۴ / اگست سنہ ۹ ۲	۱۴ / ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء

چوتھی لڑکی عابدہ قدیر بی ایس سی بی ایڈ زوجۂ وسیم احمد ایڈوکیٹ پیشۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ پانچویں لڑکی وحیدہ قدیر زوجۂ مقصود عبداللہ خان سعودی عرب (دمام) کے ایک اسکول میں اردو ٹیچر ہیں۔

محترمہ اقبال جہاں قدیر بی۔ایس۔سی۔ ایل ایل بی عثمانیہ مولوی عبدالقدیر صاحب کی دوسری صاحبزادی اور محمد یوسف علی صاحب مددگار ناظم اکسپورٹ پر وموشن ڈیپارٹمنٹ کی اہلیہ ہیں صاحب موصوف ڈاکٹر سید حیدر علی رضوی مقیم سعودی عرب اور یم احمد علی صاحب اسسٹنٹ انجنیر کے برادر حقیقی ہیں۔

عزیزی اقبال جہاں کی ذاتی صلاحیت اور ادبی ذوق کا مظاہرہ ان کے زمانۂ طالب علمی ہی سے ہوتا رہا ہے۔ ان کی اس کتاب کے مطالعے سے ہماری مشترکہ تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۱۰ رفروری ۱۹۸۵ء

منیر النساء بیگم ایم۔اے بی ایڈ عثمانیہ

پیش لفظ

دہلی اور لکھنو کے بعد ہندوستان کی ریاستوں میں حیدرآباد کی ریاست سب سے بڑا تہذیبی مرکز رہی ہے۔ یہاں کی تہذیب و تمدن کی کچھ منفرد خصوصیات اور روایات رہی ہیں جسکی شناخت کے لئے اسے دکنی تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ اس تہذیب کی جڑیں ماضی میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سلاطین خلجی کے زمانے ہی سے دکن میں بزرگانِ دین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ علاؤالدین خلجی کے حملوں اور محمد بن تغلق کے پائے تخت کی تبدیلی کے بعد شمالی ہند کے بہت سے باشندے دکن میں بس گئے تھے جسکی وجہ سے دکن میں تہذیبی اختلاط شروع ہوا۔ آگے چل کر سلاطین بہمنیہ کے عہد میں اس اختلاط کے زیر اثر ایک نئی تہذیب کی داغ بیل پڑی۔

بہمنی سلاطین کے زوال کے بعد نظام شاہی، عادل شاہی، بریدشاہی اور بالخصوص قطب شاہی فرمارواؤں نے اس تہذیب کی خونِ جگر سے آبیاری کی قطب شاہی عہد میں دکن کی تہذیب پر ایرانی اثرات کا غلبہ رہا۔ یہ تہذیب مغلوں کی تہذیب سے کئی امور میں مختلف اور ممتاز تھی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنت کے زوال کے بعد دکن کا علاقہ کچھ عرصے تک سلطنت مغلیہ کے زیر نگیں رہا۔ سلطنت آصفیہ ایک طرح سے مغلوں کی جانشین تھی

آصفجاہی دور میں دکن کی قطب شاہی تہذیب میں مغلیہ تہذیب کے اثرات کا نفوذ ہونے لگا۔ اس دور میں لکھنو سے بھی بعض رسوم و رواج اور تہذیبی روایات کو بھی فروغ ہوا۔

دکن کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں بعض مضامین اور مختصر رسالے شائع ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دکنی ثقافت کے متنوع پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیا جاتا۔ محترمہ اقبال جہاں قدیر نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے بڑی تلاش و جستجو سے اس کتاب کے لئے مواد فراہم کیا ہے دکن کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد مختلف عنوانات کے تحت، دکنی ثقافت کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے بالخصوص حیدرآباد کے تہواروں اور رسوم ورواج کے بارے میں جو تفصیلات اس کتاب میں دی گئی ہیں وہ اس طرح یکجا صورت میں کسی اور کتاب میں نہیں ملیں گی۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے میں سماج کے مختلف طبقات کا یکساں حصہ رہا ہے۔

حیدرآباد کی تہذیب قومی یکجہتی کا بے مثال نمونہ پیش کرتی ہے۔ تاریخ اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام قارئین کے ذوق تسکین کا سامان بھی اس کتاب میں موجود ہے اس کے مطالعے سے نہ صرف انکی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ انہیں اپنی تہذیبی روایات سے آگہی بھی حاصل ہوگی۔

قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں بھی یہ کتاب معاون ثابت ہوگی جو وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

تمہید و تشکر

حیدر آباد کی مشترکہ تہذیب دانشوران وقت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ حیدر آباد جو آج آندھرا پردیش کا صدر مقام ہے۔ اپنی قدیم مشترکہ تہذیب کا ورثہ دار ہے ہمارے ملک ہندوستان کی تہذیب خود مشترکہ تہذیب ہے دکن کا کلچر گنگا جمنی تہذیب کا بیش بہا ورثہ ہے جس کے سنوارنے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہاتھ رہا ہے حیدر آبادی لوگ اپنے رویہ، بول چال، رہن سہن کے ساتھ اپنی مروت سخاوت میل ملاپ اور بھائی چارگی کے باعث مشہور ہیں۔

اس کتاب میں میں نے تہذیب کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن میں قومی یکجہتی کا پرتو صاف صاف نظر آتا ہے اس شہر کے بسنے والوں کے طور طریقے، رسم و رواج آداب و سلام ذہنی اور روحانی تاثرات تک مشترک ہیں۔ کیا شاہ کیا گدا رواج کی سنہری ڈور میں سب ہی جکڑے ہوئے تھے۔

اس دیس کے بسنے والے وطن کی محبت میں سرشار، اخلاق اور مذہب کی قدروں میں پلے اور بڑھے تھے۔ ہماری تہذیب کی اصل جڑ مذہبی اور رواداری ہے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہے ہم تمام ہندوستان بھائی بہن ہیں۔ ہندو ہوں یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی یا پارسی

سبھی مادر وطن کے بچے ہیں

میری عزیز ٹیچر محترمہ نیر النساء بیگم صاحبہ نے پر مغز تعارف لکھا عالیجناب مغنی تبسم صاحب پروفیسر اُردو ڈپارٹمنٹ عثمانیہ یونیورسٹی سرپرستی کی اور پیش لفظ تحریر فرمایا ہے پدما شری نواب عابد علی خاں صاحب نے مفید مشورہ دیئے۔ کالیداس کا شیکر صاحب (بھارت گن وردھن لائبریری) اور پنڈت ہری شنکر شکلا نے تہواروں کے سلسلے میں مجھے مواد فراہم کیا۔ برادر محترم محمد علی زیرک، عنایت علی صاحب (منو بھائی) بل عبدالرشید صاحب، ڈاکٹر رحمت علی (سالار جنگ میوزیم)، عبدالحی صاحب (اُردو ہال)، مجتبیٰ علی علوی صاحب (اُردو گھر) محترمہ شاکرہ بیگم (عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری) [illegible] منشور صاحب ضروری کتابیں فراہم کیں۔ میرے چچا نواب مظفر الدین خاں صاحب حیدرآبادی نے اس کتاب کی قطعہ تاریخ نکالی ہے، منوہر راج سکسینہ صاحب علی احمد جلیلی، ڈاکٹر سید حیدر علی رضوی صاحب اور ڈاکٹر اشرف رفیع اور ڈاکٹر سعیدہ قدیر اور احمد علی [illegible] ادیبہ میں ان سب کی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں اپنے گراں قدر مشوروں سے مجھے ممکنہ مدد دی۔

میں کمشنر صاحب محکمہ انفارمیشن اور پبلک ریلیشن کا بھی شکر ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے اس شہر کے مشہور مقامات کی تازہ اور خوبصورت تصاویر اس کتاب کے لئے عنایت فرمائی۔ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے مالی تعاون کے لئے شکر گذار ہوں۔

اقبال جہاں قدیر

اِنتساب

میری والدۂ محترمہ ——————

رشید النساء بیگم صاحبہ کے نام

"جن کے پیار نے مجھے دنیا کی تمام خوشیاں

دی ہیں"

عقیدتوں کے ساتھ

اقبال جہاں قدیر

۱

حیدرآباد قطب شاہی اور آصف جاہی ادوار میں

انسان کو قدرت کی طرف سے بہت سی قوتیں عطا ہوئی ہیں جن میں ذہنی اور اخلاقی قوتیں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں جن کو سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا جائے تو تہذیب کا روپ دھار لیتی ہیں۔ تہذیب ہر قوم میں پائی جاتی ہے جو افراد کے جد و جہد، ذوق لطیف، فکر بلند اور فطری صلاحیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

حیدرآباد ایک تہذیبی شہر ہے جس میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ رہتے ہیں اس شہر میں ہندو بھی ہیں، مسلم بھی ہیں، سکھ، عیسائی اور پارسی بھی گویا یہاں کی تہذیب گنگا جمنی تہذیب ہے۔ گنگا جمنی تہذیب ایک پاکیزہ تہذیب ہے جو اپنے پاکیزہ ماحول میں پروان چڑھی پسندیدہ اخلاق اور آداب سے جس کو سنوارہ حیدرآباد کے لوگوں کی گفتگو کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو بے تکلف ہی نہیں بلکہ دل نشین بھی ہے ان کا برتاؤ دکھاوے سے دور ہوتا ہے اپنے میں سادہ آداب رکھتا ہے جس میں خلوص انگڑائیاں لیتا ہے۔ شائد خلوص انھیں محمد قلی قطب شاہ سے ورثے میں ملا ہو۔ اس نے ایک بار اللہ کی بارگاہ میں دعا کی تھی

میرا شہر لوگوں سے معمور کر ؛ رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

اللہ نے اس کی دعا قبول کی۔ اس کا شہر خوب آباد ہوا۔ پھولا پھلا۔ دکن کے اس خطے کے تمدن کی ایک تاریخ ہے۔ یہاں کے رہن سہن کے اصول میں مذہب کا گداز اور روحانی قدروں کا اثر زیادہ ہے یہاں کی قومی یکجہتی بے مثال ہے۔ ملی جلی تہذیب جو اس شہر میں صدیوں سے چلی آرہی ہے قطب شاہوں نے اس کو مستحکم کرنے میں نمایاں کام کئے ہیں جسے آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کرسکیں گی۔ اس تہذیب کی تکمیل میں آصف جاہوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ حیدرآباد کی دو مقبول شخصیتیں سلطان محمد قلی قطب شاہ اور محبوب علی بادشاہ نے اپنے دور میں عوام کے جسموں پر ہی نہیں بلکہ دلوں پر بھی حکومت کی ہے۔

اس سرزمین میں مختلف ذاتوں کے لوگ رہتے ہیں۔ مگر ان میں اتحاد اور اتفاق کی ایک غیر شعوری رنگت پائی جاتی ہے اور اس کیفیت کا اثر یہ ہے کہ ان کی تہذیب بھی مشترکہ اور زبان بھی یہ زبان اُردو زبان ہے اُردو زبان کا قدیم نام دکنی ہے

شہر حیدرآباد کا بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ قطب شاہی سلطنت کا پانچواں بادشاہ تھا سلطان قلی اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا جس نے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد گولکنڈہ کے قلعے میں ڈالی۔ سلطان قلی ترکستان کے ایک قبیلے قراقیلو کا رکن تھا۔ وہ ۸۶۰ھ میں سعد آباد کے علاقے ہمدان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام ادریس قلی تھا اس کا خاندان زیادہ تر تجارت ہی کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان پہنچا مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے جب وہ بیدر گیا اس وقت سلطان محمد شاہ بہمنی بیدر کا حکمراں تھا۔ بعض امراء توسل سے وہ شاہی دربار میں باریاب ہوا۔ سلطان قلی نے بہمنی سرکار کی ملازمت اختیار

محمد قلی قطب شاہ بانیٔ حیدرآباد

کرلی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ طبقے واری کشمکش اپنے شباب پر تھی سلطان قلی کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اہلِ ملک اور شاہی خاندان کے ساتھ وفاداری کے عوض اور اپنی ذاتی قابلیت کی بناء پر اس نے ترقی کی۔ اس کو قطب الملک کا خطاب دیا گیا تھا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد سلطان قلی خود مختار ہو گیا۔ اور اپنے طویل عہدِ حکومت میں اس نے قطب شاہی حکومت کی قلعہ گولکنڈہ میں بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشین جمشید قطب شاہ کے زمانے میں جو اپنے باپ اور بھائیوں کو مار کر تخت پر بیٹھا تھا نہ ملک نے ترقی کی نہ اور نہ تہذیب نے۔ جمشید کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم قطب شاہ جو بیجاپور میں جلا وطن ہو گیا تھا۔ اپنی شریک حیات بھاگیرتی کے ساتھ گولکنڈہ واپس آیا۔ اس نے زمانے میں سلطنت بہت مستحکم ہوئی۔ گولکنڈہ کا قدیم شہر قلعے کی چار دیواری میں آباد کیا گیا تھا۔ جو تمام ضروریات سے آراستہ تھا۔ شہر حیدرآباد کے جنوب میں [illegible] میل دور یہ قلعہ ہیروں کی منڈی کے طور پر بہت مشہور تھا۔ چنانچہ کوہ نور ہیرا جو ملکۂ برطانیہ کے سر کے تاج میں لگا ہے گولکنڈہ ہی کا ہیرا ہے۔

قلعہ گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت کی بنیاد جب پڑی اس وقت دکن کی پانچ پانچ سلطنتوں کا زمانہ تھا یہ پندرھویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ کی بات ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ قلعہ قدیم زمانے میں ہندو راجاؤں کے ماتحت ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ ۱۲[illegible] تک یہ قلعہ بہمنی بادشاہ کے زیر فرمان رہا۔ پھر قطب شاہوں کے قبضے میں آگیا۔ یہ قلعہ تقریباً پانچ سو سال قدیم ہے ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں اس قلعے کے اطراف فصیل بنا دی گئی [illegible] بجائے خود ایک قلعہ ہے جس میں کئی محل اور شاہی دفاتر تھے۔ کوہسار کی بلند ترین [illegible] تاناشاہ کی گدی میلوں کے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ گولکنڈے کے محاصرے کے وقت

تانا شاہ کی آخری قیام گاہ تھی۔ مسجد صفا گولکنڈے کے اندر ایک اچھا خاصہ شہر تھا۔ جو سب ضرورتوں سے آراستہ تھا۔ رفتہ رفتہ جب اس قلعے کی آبادی بہت بڑھ گئی تو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنے وزیر میر مومن کے مشورے پر شہر حیدر آباد کی بنیاد ڈالی۔ ۹۹۹ ہجری کا زمانہ تھا جبکہ اس شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس شہر کے بیچوں بیچ اس نے چار مینار کی ۱۸۹ فٹ بلند عمارت تعمیر کروائی۔ چار مینار کی یہ عالیشان عمارات اس جگہ واقع ہے جہاں اس کی محبوبہ بھاگ متی جو قطب شاہی دربار کی رقاصہ تھی رہا کرتی تھی۔ یہ گاؤں تھا جس کا نام چیچلم تھا۔ اب وہاں محلّہ مغلپورہ واقع ہے بادشاہ بھاگ متی سے بڑا پیار تھا۔ بعض تاریخوں اور مشہور روایتوں کے مطابق محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ کے نام پر اس شہر کا نام بھاگ نگر رکھا تھا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے جب بھاگ متی کے بطن سے حیات بخشی بیگم پیدا ہوئیں تو بھاگ متی کا اس نے نام بدلا اور حیدر محل کا خطاب دیا پھر شہر بھاگ نگر حیدر آباد کے نام سے مشہور ہو گیا۔ عموماً محققین نے اس روایت سے اختلاف رائے رکھتے ہیں اس کی یہ وجہ ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ کٹر شیعہ تھا اس پر ایرانیوں کے اثرات مرکب ہو چکے تھے۔ اور یہ کہ اُسے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بہت عقیدت تھی اس لئے یہ ممکن ہے کہ اس بادشاہ نے چار مینار کی عمارت روضہ امام رضا علیہ السلام کے روضہ کی طرح وسط میں بنائی ہو اور اس شہر کا نام حیدر کرار کے نام پر رکھا ہو اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی چہیتی رقاصہ کو جب اپنی بیوی بنائی تو اس کو حیدر محل کا خطاب بھی دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کے بناتے وقت اس نے ان دونوں چیزوں کا لحاظ رکھا ہو گا۔ ویسے ہی سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک عقلمند

قلعہ گولکنڈہ

بادشاہ تھا ہی۔ اس نے باریک سے باریک بات اور چھوٹی سے بڑی چیز کو بھی شاعری کے روپ میں ڈھالا ہے۔ تاریخ فرشتہ اور کلیات قلی قطب شاہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھاگ متی کا بڑا دلدادہ تھا اور اس کی محبت کی یادگار کے طور پر اس نے یہ شہر بسایا تھا وہ بڑے طمطراق اور جاہ و شوکت کا بادشاہ تھا حیدرآباد کا یہ شہر موسٰی ندی کے جنوب کی طرف آباد کیا گیا جس کی شکل ایک تکون کی سی ہے جس کا پہلو ندی کے ساتھ ساتھ گولکنڈے کے قریب سے شروع ہو کر مشرق کی جانب کئی میل تک پھیل گیا تھا اس شہر کے اطراف اس نے بڑے بڑے باغ لگوائے تھے۔ پہلے جہاں گاؤں اور کھلے میدان تھے وہ سب شہر میں تبدیل ہو چکے تھے۔

یہ بات مشہور ہے کہ اس شہر کے بسانے سے پہلے وہ بھاگ متی سے ملنے ندی پار کر کے گولکنڈے سے چچلم آیا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر چچلم جا رہا تھا کہ ندی میں زبردست طغیانی آئی۔ شہزادہ کسی صورت چچلم جانا ہی چاہتا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ندی میں ڈالا اور ندی پار کر کے سراپا انتظار اپنی محبوبہ بھاگ متی سے جا ملا۔ جب اس کے باپ سلطان ابراہیم کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے ندی پر ایک پل تعمیر کروایا جو پرانے پل کے نام سے مشہور ہے۔ بھاگ متی کے ساتھ ساتھ سلطان کی کل بارہ پیاریاں تھیں۔ لیکن اسے بھاگ متی سے بہت پیار تھا۔ عشق سب کچھ کرواتا ہے۔ یہ دائمی ہے اسے موت نہیں۔ ایک عاشق اپنی محبوبہ کے لئے سب کچھ کرتا ہے عشق رنگ و نسل، بڑے چھوٹے، امیر غریب، کالے گورے کا فرق رکھتا۔ بھاگ متی ایک تلنگن تھی۔ وہ بڑی بانکی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ ایک اچھی رقاصہ تھی۔ بادشاہ نے اپنے

کلیات میں بھاگ متی کے جلوہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار سے جب اس کی محبوبہ کو خطاب دیا جاتا ہے تو وہ اپنے خطاب یافتہ نام ہی سے موسوم ہو جاتی ہے۔ لوگ اس کا اصلی نام یاد نہیں رکھتے۔ لیکن بھاگ متی کا نام مٹ نہیں سکا۔ اس کو کسی نے حیدر محل بن گیا۔ بھاگ متی اور قلی قطب شاہ کی داستان حیدرآباد میں تقریباً ہر شخص کو معلوم ہے جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل کوئی چار سو سال چلی آرہی ہے اس لئے ان کو گھڑے ہوئے قصے نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے حیدرآباد کے کئی بزرگ مرد اور خواتین سے بھاگ متی کے بارے میں دریافت کیا۔ زبان زد خاص و عام یہی قصے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ بھاگ متی حیدر محل کے خطاب دینے کے بعد سے اکثر تاریخوں میں اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کو اپنی لڑکی حیات بخشی بیگم کی پیدائش پر محل میں داخل کریں تو اس نے اسے حیدر محل کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک غیر مسلم طوائف تھی اس لئے مصلحت کے طور پر اس کے نام سے بسائے ہوئے شہر بھاگ نگر کو حیدرآباد کا نام دیا ہوگا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کے اس اہتمام کے باوجود بھاگ متی کا نام دنیا فراموش نہ کر سکی۔ اس خطاب کے دینے کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی رفیق حیات کے لئے ایک محل تعمیر کروایا۔ اس نے اس محل کا نام بھی حیدر محل رکھا تھا۔ حیدر محل میں بھاگ متی مقیم تھی۔ یہ محل مٹی کے بشیر کے قریب تھا۔ کلیات قلی قطب شاہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محل میں وہ ہر سال بھاگ متی کی شادی کی سالگرہ بڑی دھوم سے اس طرح منایا تھا کہ ہر سال اُسے دولھن بنا کے اس کے جلوہ کی رسم کے لئے گانے والیوں کو ایک نیا گیت لکھ کر دیتا

بھاگ متی حیدر محل

تھا. چنانچہ اس کے حسب ذیل اشعار اسی موقع کے لئے نظم کئے گئے.

سے حیدر محل میں دائم حیدر کا جلوہ گاؤ

عرش آسمان دھرت پر نصرت طبل بجاؤ

لا سلیم ساق ساقی مجھ بزم کی صراحی

پیالے کے جوت میانے سائیں صورت دکھاؤ

سورج طبق سے گالاں میں مئے نقل دھرو تم

پیاری پرت کے ہاراں پیالے کے گل باؤ

صدقے نبی قطب شاہ جلوہ کے تخت بیٹھے

حوراں پریاں سہیلیاں مل آرسی دکھاؤ

تلنگانے کے دیہاتوں میں آج بھی بھاگ متی کے گیت گائے جاتے ہیں مشہور ہے کہ بھاگ متی اور سلطان قلی قطب شاہ کی محبت سے اس کی دوسری پیاریاں بہت جلتی تھیں۔ خود بھاگ متی کی بہن بھاگیہ لکشمی جو بادشاہ سے بے حد پیار کرتی تھی جب بادشاہ بھاگ متی سے شادی کرلی تو چار مینار سے کود کر اس نے اپنی جان دیدی تھی اب اس مقام پر ایک اچھا سا مندر بن گیا ہے کہتے ہیں کہ شادی کے بعد بھی بھاگ متی بادشاہ کے سامنے رقص کیا کرتی تھی اور بادشاہ اس کی محبت میں بہت گرفتار تھا۔ یہ چیز اس کی دوسری پیاریوں کو نہ بھاتی ہو گی۔ چنانچہ ایک بات عام طور پر حیدرآباد سے اس کے تعلق سے مشہور ہے کہ دوسری بیگمات نے بھاگ متی کے خلاف ایک پلان بنایا۔ کہ جب وہ بادشاہ کے سامنے ناچنے آئے تو اس وقت جہاں وہ ناچے کانچ کا بستر بچھا دیا جائے. چنانچہ کانچ کو باریک لپسوا کر

وہاں ڈال دیا گیا۔ بھاگ متی جب ناچنے لگی تو وہ بہت زخمی ہوگئی اور وہ اتنی زخمی ہوگئی کہ پھر ٹھیک ہی نہ ہو سکی۔ آخر کار ۱۰۰۰ھ میں وہ مر گئی۔ بادشاہ اس کی موت کے بعد سے بے حد رنجیدہ رہتا تھا کہتے ہیں کہ سلطان اس کے بعد گولکنڈہ چلا گیا تھا۔ وہ اس کے غم میں بیمار ہو گیا تھا۔ بھاگ متی کی گنبد محلہ یا قوت پورہ میں ہے اس کی گنبد بہت چھوٹی ہے چونکہ خود بادشاہ اس کی یاد میں ہر وقت غمگین رہتا تھا اور اس کی گنبد کو اتنے شاندار پیمانے پر بنایا نہ جا سکا ہو گا۔ جیسا کہ چاہیئے تھا۔ بھاگ متی کے مرنے کے تقریباً دو ڈھائی سال کی مدت تک بیمار رہ کر سلطان قلی قطب شاہ بھی چل بسا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بلند حوصلگی اور بردباری کا اس بات سے اظہار ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے ایک طوائف کے پیار کو اپنایا۔ اسے اپنے گلے لگایا اور وہ عزت بخشی کہ جب تک آسمان پر چاند ستارے رہیں گے شہر حیدرآباد کے نام کے ساتھ ساتھ بھاگ متی کا نام بھی زندہ رہے گا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس دلکش شہر کو بسایا جو رود موسیٰ کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اس کے چاروں طرف پتھریلی چٹانوں کا حصار ہے جن پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ہیں بزرگان دین کی درگاہیں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے مندر اور مساجد بھی نظر آتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ دکنی تہذیب کا زبردست علمبردار تھا۔ وہ ایک عظیم شخصیت کا مالک تھا۔ خاندان قطب شاہی کے اس فرزند نے گدی پر بیٹھنے کے بعد عدل و انصاف کو اپنا شعار بنایا اور وہ امرا اور غربا دونوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا اسی وجہ سے ہر

چارمینار سن تعمیر ۹۹۹ھ
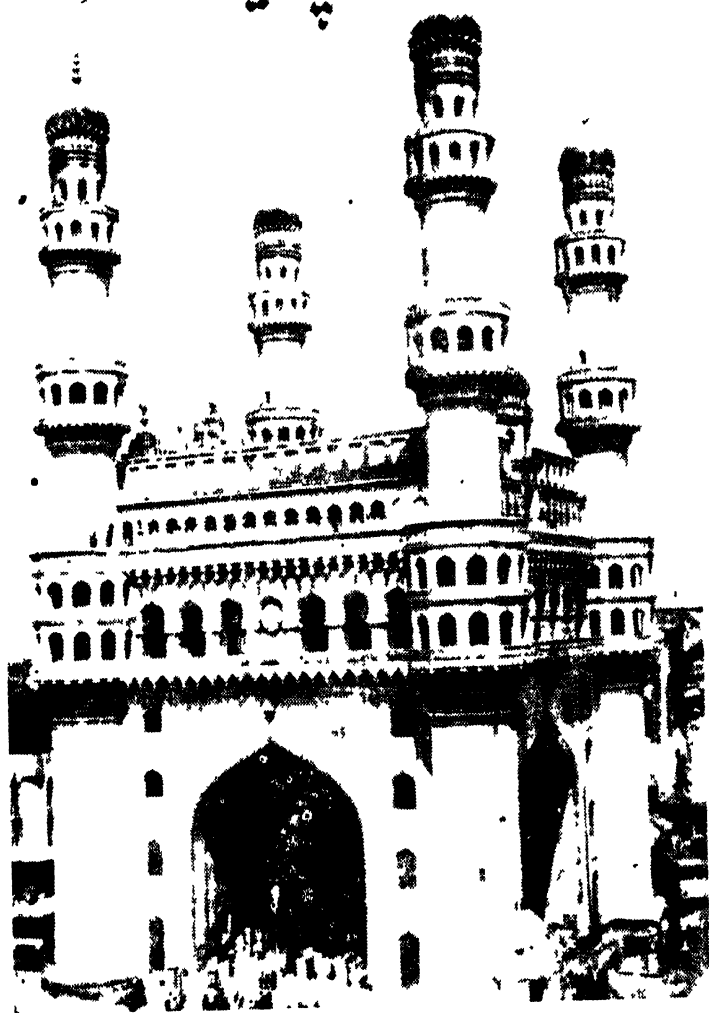
شخص بلا امتیاز مذہب وملت اس کا مدح نظر آتا تھا دکن پر اس نے ۳۱ برس حکومت کی۔ کوئی شورش اس بادشاہ نے دور میں نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی داڑھی منڈائی تھی۔ اور گلے میں آندھراؤں کا تک کپڑا ڈالتا تھا۔ اس کی تصویریں اسی قسم کے لباس میں ملتی ہیں۔ اس کی صورت وشکل بھی ہندوستانی تھی اور اس کا لباس بھی ہندوستانی تھا۔ اس کی سلطنت کے ہندو اور مسلمان شرفا اور غربا کے لباس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زرین اور لاتعداد کارناموں میں تشکیل سہری اور فن تعمیر کو بھی خاص مقام ملا۔ اس کے عہد کی عمارتیں دکنی کلچر کی آئینہ دار ہیں۔ چار مینار، جامع مسجد، گلزار حوض، چار کمان اور کئی ایک محلات بنے خداداد محل قطب مندر اور حیدر محل اسی بادشاہ کے عہد کی بنائی ہوئی شاندار عمارتیں ہیں۔ بادشاہی عاشور خانہ اور دار الشفاء اسی نے بنوائے۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنا گنبد بنوا لیا تھا۔ جس میں اس نے اسلامی طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ ہندو مندروں کے چھجے اور باب الداخلہ بنوائے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق مساجد میں جانوروں کی شکلیں نہیں بنانی چاہیئے۔ لیکن سلطان محمد قلی قطب شاہ اور حیدر محل کی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم کو مسجد میں جو اس کی گنبد کے قریبی علاقے میں ہے اس میں پرندوں کے نمایاں اشکال موجود ہیں سب سے پہلے اس نے چار مینار کی عالیشان عمارت بنوائی، جو جنوبی ہند کی عمارتوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے بڑی جاذب نظر عمارت ہے اس کی شکل تابوت جیسی ہے مشہور ہے کہ چار مینار کی تعمیر سے ایک سال قبل بھاگیہ نگر میں طاعون پھوٹ پڑا تھا۔

ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ بعض بزرگوں نے پنجوں اور تیاوبوں کے ساتھ جلوس نکالا۔ اس کے بعد وبا ختم ہوگئی۔ بادشاہ نے اس مسرت میں تابوت کی شکل میں یہ عمارت تعمیر کروائی۔ لیکن دکن کے آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ چارمینار شاہی محلات کے پر شکوہ دروازوں کے سامنے پھیلے ہوئے کشادہ صحن میں سب سے بڑے باب الداخلہ کی حیثیت سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بادشاہ کا دربار عام بھی رہا ہو۔ بعض لوگ چارمینار کو دولت کی دیوی اور حیدرآباد کی قسمت کی دیوی کا مسکن کہتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے محلوں میں خداداد محل سب سے بڑا محل تھا یہاں بیٹھ کر بادشاہ مظلوم اور پریشان حال لوگوں کی دادرسی اور انصاف کرتا تھا۔ چندن محل میں فوج کا پہرہ رہتا تھا۔ گگن محل میں فوجیں مقیم تھیں۔ بسنت محل میں صبح شام شاہی باورچی خانے سے کھانا پک کر آتا تھا اور روزآنہ شاہی دستر خوان چنے جاتے تھے۔ جہاں وقت واحد میں دس ہزار آدمی کھانا کھاتے تھے۔ محل قطب مندر میں بادشاہ خود ہی رہتا تھا۔ محل میں سوائے بیگمات کے دوسرے لوگوں کا آنا منع تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ تمام محلات قطب شاہی سلطنت کے زوال تک باقی رہے۔ اس کے علاوہ اس نے کئی مساجد، عزاخانے، کارواں سرائیں مدرسے اور شفاخانہ بھی بنوائے۔

بادشاہی عاشورخانہ اسی کے زمانے کی تعمیر کی ہوئی عمارت ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی پوری زندگی میں کسی شخص کے قتل یا قصاص کا حکم نہیں دیا۔ اس کا یہ عظیم کارنامۂ حیات ہے کہ اس نے مختلف مذاہب کے ماننے

والوں میں میل جول اور اتحاد قائم کر کے دکنی تہذیب کو جنم دیا۔ اس کے زمانہ میں پتنگوں کے جلسے، برسات میں مرگ لگنے کے وقت کے جشن بسنت اور نوروز کی رسمیں، محرم میں دس دن تک عزاخانوں اور دیوڑھیوں کی رونق اور چہل پہل امام حسینؑ کے نام پہ فقیر بننے، شربت کھچڑی پکانے اور کھلانے کا طریقہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج تھا۔ حضرت علی شیر خدا نام پر شیر بننے والوں میں ہندو اور مسلم دونوں شامل تھے۔ نعل صاحب کی سواری کے ساتھ مشعلیں لیکر چلنے والوں کا یہی حال تھا۔ دیہات کے ہندو اپنے بچوں کے نام امام حسن اور امام حسین کے نام پر [illegible] رکھتے تھے۔ یہ سب محمد قلی قطب شاہ کے پیدا کردہ تمدن کا نتیجہ تھا۔ اس بادشاہ کو ملک میں ایک مشترک تہذیب کے رواج دینے کا فخر حاصل ہے پروفیسر سید محی الدین قادری زورؔ نے قطب شاہی دور پر تحقیقی کام کیا اور یوم قلی قطب شاہ منا کر اس زمانے کے حالات سے آگاہی بخشی اور بتایا کہ دکن کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ تھے۔ اس زمانے کی اُردو میں اس شاعر نے بہت عمدگی سے دکنی رسم و رواج رہن سہن حد یہ کہ موسموں، پھولوں، پھلوں، اور درختوں پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ سلطان نے دکن کا پہلا مرثیہ گو شاعر بھی تھا۔ بادشاہ ہونے کے باوجود وہ ایک عوامی شاعر بھی تھا۔ اس بادشاہ کا کلام فارسی اور اردو میں وسیع ملتا ہے البتہ تلگو زبان اس نے شاعری میں کی۔

شہر حیدرآباد کے چپے چپے پر محبت اور رواداری کے نقوش ملتے ہیں۔ اس بادشاہ کا پورا دورِ حکومت ہندو مسلم اتحاد کی قدروں کو پیش کرتا ہے۔ سنہ ۱۶۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

۱۶۱۲ء میں محمد قلی قطب شاہ کا داماد محمد قطب شاہ اس کا جانشین ہوا یہ بادشاہ کم سخن، دین دار اور خدا پرست تھا۔ قرآن شریف اور حدیث پر اس کو کافی عبور حاصل تھا۔ اس بادشاہ نے سلطنت کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ جہاں ناچ رنگ کی محفلیں ہوتی تھیں وہ نماز اور قرآن پڑھے جانے لگے۔ دینی اور مذہبی مباحثے ہونے لگے۔

سلطان قطب شاہ کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا۔ شہر کے وسط میں ایک بڑی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور مسجد کی تعمیر شروع کروائی، اس کی خواہش تھی کہ شہر کے تمام مسلمانوں کو اس مسجد میں یکجا نماز پڑھتا دیکھے۔

محمد قطب شاہ نے اس مسجد کا نام بیت العتیق رکھا۔ یہ مسجد اورنگ زیب کے عہد میں پائے تکمیل کو پہنچی۔ مکہ شریف سے ایک پتھر منگوا کر اورنگ زیب اس مسجد میں نصب کروایا اور اس کا نام مکہ مسجد رکھا۔ قطب شاہوں کے بعد آصف جاہی حکمرانوں نے بھی اس مسجد کی نگرانی اور تحفظ کا پورا بندوبست کیا چنانچہ آج تک یہ آباد اور بارونق ہے۔

سلطان قطب شاہ بھی صاحب دیوان شاعر تھا۔ ظل اللہ تخلص تھا۔ اس کا دربار بھی اہل سخن سے بھرا رہتا تھا۔ مختلف اصناف سخن میں کمال حاصل تھا۔ پندرہ سال کی حکمرانی کے بعد اس نے وفات پائی۔

محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کی بیوی حیات بخشی بیگم پندرہ سال تک ملکہ بنی رہی اور اس نے شاہی سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حیات بخشی بیگم کے لئے اس کی شادی سے پہلے ہی اس کے باپ نے ایک عالیشان

قطب شاہی گنبد

محل تیار کروایا تھا۔ جو دولت خانۂ عالی کے جنوب میں واقع تھا۔ اب وہاں محلہ مٹی کا شیر اور قدیم قطب شاہی مسجد واقع ہے۔ حیات بخشی بیگم کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔

جب اس کا پہلا لڑکا عبداللہ قطب شاہ پیدا ہوا تو اس وقت سلطان محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا سلطان محمد قطب شاہ حکومت کر رہا تھا اس شہزادے کی پیدائش کی پوری خوشی نہیں منائی جا سکی۔ چونکہ نجومیوں نے کہا تھا کہ اس شہزادے کو بارہ برس تک باپ سے دور رکھا جائے اس کے دو سال بعد علی مرزا پیدا ہوا تو اس کی ولادت پر جشن منائے گئے۔ حیات بخشی بیگم کی شادی کے چار سال بعد سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تھا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں سلطنت عروج پر تھی۔ اس کا زمانہ بہت پر امن گزرا۔ سلطان محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد جب عبداللہ قطب شاہ اس کا جانشین ہوا اس وقت اس کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ کم سنی کی وجہ سے مہمات سلطنت اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔ اسی لئے اس کی ماں حیات بخشی بیگم اور اس کی دادی آغا خانم حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ تمام سیاسی اور انتظامی امور ملکہ حیات بخشی بیگم ہی کے ذریعہ طے پاتے تھے۔ لنگر کی ابتدا اس کے زمانے سے شروع ہوئی۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۴۱ھ کو سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے ہاتھی صورت پر سوار ہو کر حیدرآباد سے گولکنڈہ جا رہا تھا۔ موسیٰ ندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھی ندی کے شورش تلاطم کو دیکھ کر مست ہو گیا۔ مہاوت کو ہلاک کر کے جنگل کی طرف چلا گیا۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ وہ ہاتھی سے اتر جائے۔ لیکن کامیابی

نہیں ہوئی۔ ہاتھی جدھر جاتا تا نکل جاتا۔ جب یہ خبر حیات بخشی بیگم کو ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اور اس نے حکم دیا کہ جنگل کے درختوں پر توشے دان اور پانی کی چھاگلیں لٹکادی جائیں۔ تاکہ ہاتھی جس درخت کے نیچے ٹھیرے سلطان کچھ کھاپی سکے۔ ذالحجہ کی آخری تاریخ تک یہی حال رہا محرم کا چاند دیکھکر حیات بخشی بیگم نے منت مانی کہ اگر سلطان صحیح سلامت واپس آجائے گا تو چالیس من سونے کی زنجیر بناکر حسینی علم لے جائیگی اور اسے نذر کردے گی۔ اس منت کے بعد ہاتھی کی مستی غائب ہوگئی اور سلطان گولکنڈہ پہنچ گیا۔ ملکہ حیات بخشی بیگم نے جھٹ سے منت پوری کی۔ پھر ہر سال یہ رسم جاری رہی۔ عبداللہ قطب شاہ کے سن شعور کو پہنچنے تک حیات بخشی بیگم بڑی دانائی سے حکومت کرتی رہی۔ پھر سلطان عبداللہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس بادشاہ میں سیاسی تدبر اور بیداری کے جوہر مفقود تھے کیونکہ وہ عیش پرست تھا۔ اس کی لاپرواہی کی وجہ سے ملک کو زوال آگیا۔ اور مغلوں نے حملے شروع کردیے پہلی بار جب مغلوں نے ہنگامہ آرائی کی حیات بخشی بیگم نے بڑی دانائی سے صلح کروادی۔ حیات بخشی بیگم نے حیات نگر کا قبضہ آباد کیا۔ حیات نگر میں ایک سرا اور مسجد تعمیر کروائی۔ ماں صاحب کا تالاب، مسجد قطب عالم متصل فتح دروازہ مسجد واقع دولت خانہ عالی، علم نعل صاحب کی کنوئیں اور کاروان سرائیں بھی اس نے تعمیر کروایا۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا داماد ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہوا۔ وہ بہت نازک تھا۔ تاناشاہ کی نزاکت حیدرآباد میں مشہور ہے

نہایت دور اندیش حکمراں تھا۔ اس نے چودہ برس تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں حیدرآباد اُردو شاعروں اور انشا پردازوں کا مرکز رہا۔ تانا شاہ کے زمانے میں حکومت گولکنڈہ قلعے کے اندر تھی۔ تانا شاہ حضرت شاہ راجو قتالؒ کا معتقد تھا انھوں نے تانا شاہ کو خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ اورنگ زیب نے رُسی زمانے میں قلعہ گولکنڈہ کی تسخیر کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف صاحبؒ اور شریف صاحبؒ جن کی درگاہیں نامپلی میں ہیں اورنگ زیب کی فوج کے سپاہی تھے عالمگیری لشکر کنٹہ میر جملہ سے ہوتا ہوا قلعہ گولکنڈہ جارہا تھا۔ اس وقت کنٹہ میر جملہ پر حضرت برہنہ شاہ صاحبؒ معہ اپنے معتقدین کے تشریف فرما تھے۔ ان میں مجذوبوں کی سی کیفیت سرایت کرگئی تھی جب لشکر قریب آیا تو برہنہ شاہؒ نے اپنے معتقدین میں سے ایک کپڑا مانگ کر اوڑھ لیا۔ مریدوں نے سبب معلوم کیا تو ایک مرید کی گردن اپنی بغل میں لیا تو اس نے دیکھا کہ لشکر میں صرف دو انسانی صورتیں نظر آرہی تھیں باقی سب سپاہی حیوان تھے برہنہ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ بزرگوں کا ادب لازمی ہے وہ دو انسان حضرت یوسف صاحبؒ اور شریف صاحبؒ تھے۔

اورنگ زیب کی مغل افواج نے گولکنڈے کا محاصرہ کرلیا تھا اور فوجیں خیموں میں مقیم تھیں۔ کئی مہینے محاصرہ آرائی میں گزر چکے تھے لیکن قلعے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اورنگ زیب سمجھا تھا کہ یہ قلعہ چھوٹا ہے اور اہل قلعہ بھوک اور پیاس کی تنگی سے ایک نہ ایک دن قلعہ کا دروازہ ضرور کھول دیں گے۔ مگر اورنگ زیب کا یہ خیال غلط نکلا۔ اورنگ زیب پر یہ

یہ وقت انتہائی صبر آزما تھا۔ بارش کا موسم شروع ہوگیا تھا اس لئے مغل فوجوں کو بہت نقصان پہنچا۔ آخر کار دھار بارش اور تند ہواؤں سے پورا ماحول تاریک ہوگیا۔ بارش کی وجہ سے افواج کے خیمے اکھڑ گئے۔ اورنگ زیب یہ تباہی کا منظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دور ایک خیمے میں ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اورنگ زیب اس خیمے میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ دو بزرگ قرآن کی تلاوت میں مصروف ہیں یہ یوسف صاحبؒ اور شریف صاحبؒ تھے۔ اورنگ زیب نے ان کی روحانی کیفیت دیکھکر دعا کرنے کو کہا۔ ان دونوں بزرگوں نے جواب دیا کہ قلعہ کا فتح کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے کیونکہ دوسری طرف ولی اللہ تانا شاہ کے حق میں دعا گو ہیں اصرار پر انھوں نے ایک ٹھیکری پر کوئلے سے کچھ لکھ کر اورنگ زیب کو دیا اور کہا کہ قلعے کے دروازے کے باہر ایک بزرگ موچی بھیس بدل کر بیٹھے ہیں۔ ان کو دو۔ اورنگ زیب نے ویسا ہی کیا تو وہ بزرگ بہت برہم ہوئے اور کہا کہ میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔ یہ جواب اورنگ زیب سے سُنکر حضرت یوسف صاحبؒ شریف صاحبؒ ٹھیکری پر کچھ اور لکھ بھیجی۔ جسے دیکھ کر موچی صاحب کو بہت غصہ آگیا۔ میری پچاس سال کی محنت رائیگاں ہوگئی اور فوراً وہ وہاں سے چلے گئے حضرت یوسف صاحبؒ شریف صاحبؒ تب بشارت دی کہ قلعہ صبح تک فتح ہو جائیگا۔ ایک نمک حرام شاہی افسر نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی عبدالرزاق لاری اور قطب شاہی افواج نے مدافعت کی اور خوب مقابلہ کیا۔ اورنگ زیب کو فتح ہوئی۔ ابوالحسن تانا شاہ اور عبدالرزاق لاری کو

گرفتار کرکے اورنگ آباد کی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں ان کی وفات ہوئی۔

قطب شاہوں کے تمدنی کارموں کا جائزہ لینا بہت مشکل ہے قطب شاہی سلطنت کا آغاز اور عروج بڑے دلچسپ واقعات سے ہوا تھا۔ اس سلطنت کے اختتام پر بھی بڑے پرسوز واقعات پیش آئے تھے۔ گولکنڈے کے محاصرے کے وقت جو عزم و استقلال کے مظاہرے ہوئے تھے۔ ان کو سنکر ہمارے دلوں میں ملوئے ہمت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ یہ محاصرہ تقریباً آٹھ مہینے تک جاری رہا جس کی مدافعت کا انتظام، دشمن کا مقابلہ اور اہل قلعہ کی وفاداری پوری طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ نے بڑی تمکنت سے دشمن کا سامنا کیا تھا۔ اس وقت اس بادشاہ نے جن بلند پایہ اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا اس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملے گی۔

اورنگ زیب کے مرنے کے بعد تخت نشینی کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر، عظیم شاہ اور جہاں دار شاہ ایک کے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے جب آگرے کی لڑائی میں فروغ سیر نے فتح پائی۔ اور اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر ڈالا اور اپنے خیر خواہ ملازم نواب میر قمرالدین خاں کو نظام الملک آصف جاہ کا خطاب دیا۔ ۱۷۲۲ء میں محمد شاہ کے عہد میں آصف جاہ دہلی کے وزیر مقرر ہوئے اس زمانے میں بادشاہ اور امرائے سلطنت عیش پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محمد شاہ بظاہر تو مہربان تھا۔ لیکن بہادر خاں کو جو دکن کا گورنر تھا اس نے خفیہ طور پر حکم بھیجا کہ آصف جاہ اول کو معزول کرکے خود دکن کا صوبہ دار بن جائے۔ جنگ ہوئی اور مبارز خاں مارا گیا۔ تب آصف جاہ نے مرکز سے

قطع تعلق کرکے اپنی آزاد اور خود مختار ریاست قائم کی۔ اور اس طرح دکن میں آصفجاہ سلطنت کی داغ بیل پڑی۔

خاندانِ آصفجاہی کے بانی نواب میر قمرالدین خاں تھے۔ ان کے آباو اجداد ولایت ترکستان میں علم و فضل اور بزرگی کی وجہ سے مشہور تھے ان کے دادا خواجہ عابد خاں شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہ نے ان کو شہزادہ اورنگ زیب کی اتالیقی پر مامور کیا۔ جس زمانے میں عالمگیر نے گولکنڈہ کا محاصرہ کیا تو اس معرکہ میں وہ بھی شریک تھے۔ لڑائی میں ان کے شانے پر ایک توپ کا گولہ لگا۔ جس کے صدمے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ حمایت ساگر کے پاس ان کا مقبرہ ہے۔ جس کو خلیج خان کی بارہ دری کہتے ہیں خواجہ عابد خاں کے فرزند میر شہاب الدین غازی الدین خاں نے بھی دکن کے معرکوں میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ شہنشاہِ عالمگیر ان کی بڑی قدر کرتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر مغل افواج کے آڑے وقت پر مدد کی تھی۔ عالمگیر کے بعد فیروز جنگ شاہ عالم کے زمانہ میں مالوے اور گجرات کے صوبیدار ہوئے۔ ۱۷۱۰ء میں میر شہاب الدین غازی الدین خان فیروز جنگ کا انتقال ہوا۔ ان کی لاش دہلی بھیج دی گئی۔ ان ہی کے قابل فرزند نواب میر قمرالدین خاں تھے جو آگے چلکر نظام الملک آصف جاہ بانی دولتِ آصفیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

میر قمرالدین خاں ۱۶۷۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ سیدالنساء بیگم نواب سعداللہ خاں وزیر اعظم شاہ جہاں کی صاحبزادی تھیں پہلی مرتبہ جب وہ اپنے والد کے ساتھ عالمگیر کے دربار میں گئے۔ تو بادشاہ نے ان کو دیکھکر

کہا کہ "بچہ بہت ہونہار ہے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کرو۔ اور ہفتہ میں ایک مرتبہ ہمارے یہاں بھیجا کرو"۔ چنانچہ بچپن ہی سے دربار کی حاضری آپ پر لازم ہوگئی تھی۔ ایک دفعہ شہنشاہ عالمگیر چند امیروں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے گئے تھے۔ میر قمرالدین کی عمر اس وقت صرف سولہ سال کی تھی وہ بھی سیر میں شریک تھے بادشاہ نے ساتھیوں سے پوچھا "ایک مدت سے یہ درخت پڑھتا نہیں ہے کیا وجہ ہوگی؟" میر قمرالدین خان نے جواب دیا کہ "اس کے قریب تناور درخت ہیں قاعدہ ہے کہ بڑوں کے مقابلے میں چھوٹا پنپ نہیں سکتا"۔ بادشاہ نے کہا کہ اں کودک بے تخت و تاج بادشاہی می خواہد کرد"۔ عالمگیر نے خاص توجہ سے ان سرپرستی کی۔ انیس سال کی عمر علوم درسی اور فنون سپہ گیری میں مہارت حاصل کرلی۔ ابتدا میں عالمگیر نے ان کو چار ہزاری منصب اور غلیج خان کے خطاب سے سرفراز کیا اور قلعہ وائنف کھیڑ کی تسخیر پر پانچ ہزاری منصب اور کرناٹک کی صوبہ داری دی۔ اسی زمانے میں عالمگیر کا انتقال ہوگیا۔ جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس وقت وہ غیرجانب دار رہے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ ۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ کا بھتیجہ فرخ سیر تخت نشین ہوا۔ اس نے آپ کو فتح جنگ نظام الملک کا خطاب عطا کیا۔ اور ہفت ہزاری منصب اور سات ہزار سوار دیکر دکن کا صوبہ دار بنایا۔ جب سادات بارہہ کے ہاتھ میں مغلوں کا تخت و تاج گیا تو سید عبداللہ اور حسین علی خان شہنشاہیت پر قابض ہوگئے تھے حسین علیخان دکن کی صوبہ داری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور بادشاہ نے اس سنبھل مرادآباد حکومت عطا کی اس طرح جب مغلوں کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اور دربار

کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا تو اس کا اثر عام معاشرتی اور تمدنی حالات پر پڑا۔ تمام ملک میں افلاس اور بدامنی پھیل گئی تھی خصوصاً دہلی کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی۔ علوم و فنون سے ماہرین کے دل و دماغ خوشی اور مسرت کے نور سے محروم ہو گئے تھے۔ چنانچہ علما، فضلا اور شعرا، شرفا، مشائخ اور امرا ایک کے بعد دیگر دہلی سے نکلے اور دکن پہنچ گئے۔ کیونکہ ان کے لئے اگر کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ پرامن دربار آصفی ہی تھا۔ حضرت مغفرت مآب کی قدردانی کا شہرہ سن کر عرب، ماوراءالنہر خراساں، عراق، ہندوستان اور سندھ سے سادات علما، اور مشائخ کے گروہ اورنگ آباد دکن میں جمع ہو گئے اور جب حوصلہ و لیاقت دربار آصفی سے سرفراز ہوئے۔ مشہور ہے کہ مغفرت مآب کے پاس دو لشکر تھے ایک لشکر دغا اور دوسرا لشکر دعا کا تھا۔ دعا کے لشکر میں جانباز سپاہیوں کا ایک گروہ تھا جو ان کے ساتھ دہلی سے دکن آیا تھا۔ لشکروں میں صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ جن کی دہلیز پر بڑے بڑے گردن فراز بھی پیشانیاں رگڑتے تھے۔ اس مقدس جماعت کے افراد گوشہ نشین نہ تھے بلکہ میدانی معرکوں میں عام سپاہیوں کی طرح حصہ لیتے تھے۔ آصف جاہ اول کی بدولت دکن علم و فضل کا گہوارہ بن چکا تھا اور ان کے ساتھ جو آبادی اورنگ زیب میں بس گئی تھی اس میں بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے اورنگ آباد ان کا پایہ تخت تھا کہا جاتا ہے کہ اس وقت اورنگ آباد کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی جس کی تہذیب و تمدن معاشرت بود و باش کا نقشہ بالکل دہلی کا سا تھا انتیس (۲۹) سال آصف جاہ اول نے حکومت کی اور وفات پائی۔

نظام الملک آصف جاہ اوّل کی تعلیم و تربیت اورنگ زیب کے زیرِ
نگرانی ہوئی تھی۔ زبردست سپہ سالار اور مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک
بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی تھے پہلے شاکر پھر آصف تخلص کیا۔ ان کے عہد میں
اورنگ آباد شعر و سخن کا مرکز بنا رہا۔ ان کے دربار میں شعرا عرب سے غرب تک
جمع ہوتے اور محفل سخن آراستہ ہوتی تھی۔ وہ خود بھی شعر و سخن میں دلچسپی لیتے تھے۔
درباری شعرا میں درگاہ قلی خاں درگاہ، خواجہ قلی خاں موزوں علی نقی خاں ایجاد
اور مرزا داؤد قابل ذکر ہیں۔ موسوی خاں فطرت اور مرزا خاں ہمدانی کو میر منشی
اور مشہور مورخ ہاشم خوانی خاں کو دیوان مقرر کیا۔ عارف الدین خاں عاجز
کو منصب عطا کی۔ موسوی خاں جرأت کو دو ہزاری منصب تک ترقی دی گئی
تھی۔ نثر میں آصف جاہ اول نے ایک تاریخی وصیت نامہ اپنے آخری وقت
میں اپنے لڑکے ناصر جنگ کو بٹھا کر لکھوایا تھا اُردو نثر میں جو ایک شہ پارے
سے کم نہیں۔

آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد آصف جاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔
میر نظام علی خاں آصف جاہِ ثانی سنہ ۱۷۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ
نام عمدہ بیگم تھا۔ آصف جاہِ ثانی سے پہلے ان کے تیسرے بھائی صلابت جنگ
آصف الدولہ امیر الملک حیدرآباد کے فرمانروا ہوئے۔

آصف الدولہ ثانی سے پہلے ان کے تیسرے بھائی صلابت جنگ اور مظفر جنگ
کے مرنے کے بعد حیدرآباد کی عنان حکومت سپرد کی گئی۔ کافی عرصہ تک نظام علی کی
برار کے صوبہ دار رہے۔ صلابت جنگ چونکہ سلطنت کے اہل نہیں تھے اس لئے انہوں

نے انتظام مالی اور ملکی نظام علی خاں کے سپرد کر دیا۔ دشمنوں نے صلابت جنگ کو وزارت سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور حیدرآباد کا صوبہ دار مقرر کیا۔ صلابت جنگ کی کمزور طبیعت کی وجہ سے سلطنت کا امن خطرے میں پڑ گیا۔ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل گیا بہ تقاضائے وقت نواب صلابت جنگ کو قلعہ بیدر میں گوشہ نشین کر کے آصف الدولہ ثانی مسند نشین ہوئے۔ یہ زمانہ حیدر علی، ٹیپو سلطان، انگریزوں اور فرانسیسیوں کے جنگ و جدل کا تھا۔ انھوں نے بڑی ہمت سے ان سب کا مقابلہ کیا۔

نواب سکندر جاہ کے والد آصف جاہ ثانی کا ۱۸۰۳ء میں انتقال ہوا تو سکندر جاہ نے اپنے باپ کی جانشینی سے مصلحتاً انکار کرنا چاہا مگر سلطنت کے کارپردازوں نے سکندر جاہ کو سمجھا بجھا کر تخت نشینی پر آمادہ کر ہی لیا۔

نواب سکندر جاہ نہ صرف رعایا پرور، ہمدرد بادشاہ تھے۔ بلکہ علوم و فنون کے قدر داں اور مشرقی تہذیب کے دلدادہ بھی تھے۔ کئی امراء اور معززین کو خطابات اور بڑے بڑے منصب عطا کئے اپنے بھائیوں کی تنخواہیں بھی دگنی کر دیں۔ فن تعمیر سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کے عہد میں حیدرآباد سے بمبئی اور مدراس تک پختہ سڑک بنوائی گئی۔ جس کی ایک ایک منزل پر مسجدیں سرائیں اور کنوئیں تعمیر کئے۔ شہر حیدرآباد کے ساتھ سکندرآباد کو بھی جو انھیں کے نام سے موسوم ہے خاص رونق حاصل ہو گئی۔ ساڑھے چھبیس سال حکومت کر کے ۱۸۲۹ء کو انتقال کیا اور مکہ مسجد کے صحن میں مدفون ہیں۔

سکندر جاہ کے انتقال کے تیسرے دن ان کے فرزند میر فرخندہ علی خاں

جن کو آصف الدولہ سوم نے بچپن ہی میں ناصر الدولہ کا خطاب دیا تھا چھتیس سال کی عمر میں ۱۸۲۹ء میں جانشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں ریاست کا مالیہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ ۱۸۴۹ء تک انگریزوں کے چونسٹھ لاکھ روپیے کے مقروض ہو گئے جو ادا نہ ہونے پر ملک برار اور رائچور کا دوآبہ انگریزی حکومت کے حوالے کرنا پڑا۔

یہ عام تعلیم کے علاوہ اپنے والد ہی کے عہد میں فنون جنگ سے بھی واقف ہو چکے تھے۔ اللہ والوں اور درویش سیرت لوگوں کے بڑے معتقد تھے سپہ گیری کے ساتھ ساتھ انھیں عمارتیں بنانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ چنانچہ چادر گھاٹ کا پل فتح دروازے اور لال دروازے کے حصار انھیں کے زمانے میں تعمیر ہوئے۔

آصف جاہ چہارم کے سب سے بڑے بیٹے میر تہنیت علی خاں تھے۔ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ والد نے ابتدا ہی سے انہیں افضل الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ فطری طور پر کھیل کود سے دور رہے اور بڑے بوڑھوں کی صحبت اور علماء اور مشائخ کی نگرانی میں زیادہ وقت گزرتا رہا۔ نواب سالار جنگ مختار الملک اور نواب شمس الامرا بہ حیثیت اتالیق ان کے نگران تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے تیسرے دن ۱۸۵۷ء کو بتیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ مدار المہام وقت سر سالار جنگ نے شہر میں ان کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ انھیں کے عہد حکومت میں جدید حیدر آباد دکن کی ابتدا ہوتی ہے۔ ممالک محروسہ حیدر آباد کی پیمائش ہو کر اس کو پانچ صوبوں اور سترہ ضلعوں اور کئی تعلقوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں برار کا علاقہ شامل نہ تھا ان کے عہد میں سلطنت کا مالیہ بڑھا اور خوشحالی کا دور شروع ہوا۔

افضل الدولہ کو آرزو تھی کہ خدا انھیں بیٹا دے وہ آرزو اس طرح پوری ہوئی کہ ۱۷ اگست ۱۸۶۶ء کو ان کے ہاں ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا جس کی چراغ دکن سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے میر محبوب علی خاں نام رکھا گیا۔
ایک دن افضل الدولہ نے سالار جنگ کو فوراً یاد کیا اور ننھے منے شہزادے کو ان کی گود میں دیتے ہوئے کہا کہ خدا کی اس امانت کو میں تمہارے حوالے کرتا ہوں
۲۶ جنوری ۱۸۶۹ء کو افضل الدولہ کا انتقال ہوا تو مختار الملک کے مشورے کے مطابق میر محبوب علی خاں کی تخت نشینی کی رسم انجام دی گئی جب اس ننھے بادشاہ کی عمر صرف ڈھائی سال کی تھی۔ سالار جنگ نے اس کمسن شہزادے کی تسمیہ خوانی ۵ نومبر ۱۸۷۰ء کو بڑی دھوم دھام سے کی۔ عربی، فارسی، انگریزی اور فنون سپہ گری کی تعلیم کے لئے منتخب اتالیق مقرر کئے۔ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد نواب میر محبوب علی خاں کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ داغ دہلی کے شاگرد ہوئے اور انھیں پندرہ سو روپئے ماہوار پر حیدرآباد بلایا۔
نشانہ بازی اور بندوق چلانے میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ دشوار گزار اور خوف ناک مقامات پر جاکر انھوں نے کئی شیر مارے۔
یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو دربار قیصری دہلی میں منعقد ہوا جس میں تمام ہندوستان کے والیان ریاست اور نمائندے شریک تھے اس دربار میں محبوب علی بادشاہ کی کرسی وائسرائے کی کرسی کے برابر تھی۔
۷ فبروری ۱۸۸۳ء کو سالار جنگ نے ایک مخصوص دعوت کا میر عالم کے تالاب پر انتظام کیا تھا جس کے فوراً بعد ہی سالار جنگ ہیضہ میں مبتلا ہوکر انتقال کرگئے۔

سالار جنگ کے انتقال کے بعد جب کوئی ذمہ دار مدار المہام نہیں رہا اور سیاسی الجھنیں پیدا ہونے کا اندیشہ محسوس ہوا تو نواب میر محبوب علی خاں ۱۸۸۴ء وائسرائے سے ملنے کے لئے کلکتہ گئے۔ آخر کار ملکہ وکٹوریہ اور ان کی حکومت کی طرف سے محبوب علی خاں کو پورے پورے اختیارات اور خطابات دیئے گئے۔ لائق علی خاں کے عہد مدار المہامی میں فارسی کی جگہ اردو رائج کی گئی۔

نواب میر محبوب علی خاں کے عہد حکومت میں میر محکمہ اور سررشتے کے متعلق اکثر نئے قانون بنے۔ اسی طرح پولیس کا ایسا عمدہ انتظام ہوا جو پہلے کبھی نہ تھا۔ روہیلوں اور عرب قوموں کو مطیع اور نیک چلن بنا دیا۔ ان کے عہد ہی میں روئی پارچہ بافی، ریشم اور شال کے کارخانے قائم ہوئے۔ جس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں کا تیار شدہ کپڑا ولایتی کپڑے کا مقابلہ کرنے لگا۔ معدنیات کا کام بھی اسی عہد میں جاری ہوا اور کہیں کہیں ہیرے اور سونے کی کانیں بھی دریافت ہوئیں۔ رعایا کی تعلیم کے لئے مدرسے اور کالج کھولے گئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا زمانہ مدرسوں میں انتظام کیا گیا۔ شاہی افراد اور امیرزادوں کی تعلیم و تربیت کا علیحدہ انتظام کیا گیا۔ ولایت میں تعلیم پانے والے طالب علموں کو سالانہ خرچ ملنے لگا۔ اس طرح حیدر آباد میں اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند ہوا۔ رفاہِ عام کے کاموں میں بھی محبوب علی خاں کے عہد میں لاکھوں روپئے خرچ کئے گئے۔ زنانہ ہسپتال چوک کی مارکٹ اور چوک کا گھنٹہ گھر شکار گاہ ملک پیٹ، کنگ کوٹھی سنٹرل جیل فتح میدان کا گھنٹہ گھر ورک شاپ (دار الضرب) اور دفتر باب حکومت (سکریٹریٹ) شاہی محل اسی زمانے کی یادگاریں ہیں۔

رعایا کے ساتھ رواداری، محبت باہمی اتحاد اور برتاؤ میں فرق نہ کرنا اور ہر فرقے کے لوگوں کو یکساں سمجھنا غفران مکان کی شاہانہ زندگی اور حکمت عملی کا بہت اہم اور نمایاں اصول رہا ہے۔ حضرت غفران مکان اس سمجھتے تھے۔ کہ امرائے سلطنت موروثی حقوق رکھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ وفاداری بھی بقائے سلطنت کے لحاظ سے رکھنا چاہیئے۔ اور ایک طرف بادشاہیت اور دوسری طرف امرا اور ہندو مسلم رعایا سلطنت کے لازمی اجزا ہیں۔ ان کی خوشی اور غمی کے موقع پر ہمدردی اور دلجوئی کرنا چاہیئے۔ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کے بنانے میں حیدرآباد کے فرماں رواں کا ذکر نہایت ضروری ہو جاتا ہے اس لئے سنسکرت میں کہتے ہیں۔ تھا راجہ تتھا پرجا" یعنی جیسا راجہ ہوتا ہے ویسی ہی رعایا ہوتی ہے۔ آصف جاہی حکمراں مسلمان سنت الجماعت لوگ تھے لیکن ان کی رعایا میں غیر مسلم زیادہ تھے۔ اور مسلمان بہت کم تعداد میں تھے۔ چونکہ آصف جاہی فرمارواے دکن مغلوں کے جانشین تھے اس لئے انھوں نے مذہبی رواداری کو اپنا فرض اولیں تصور کیا اور حکومت اس انداز سے کی کہ انقلاب کے سیلاب تک اس بات کا پتہ نہیں چلا کہ کون کس مذہب کس قوم اور کس فرقہ کا ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دونوں آنکھوں سے تعبیر کرتے تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے یہاں ۵/ اپریل ۱۸۸۶ء کو امتہ الزہرہ بیگم کے بطن سے پہلا شہزادہ تولد ہوا جس کا نام نواب میر عثمان علی خاں رکھا۔ حسب دستور پانچ سال کی عمر میں ان کی تسمیہ خوانی کی رسم ادا کی گئی۔

عماد الملک اور سر لیجرٹن دینی اور مذہبی تعلیم پر معمور ہوئے بصوری سے

انھیں غیر معمولی دلچسپی رہی۔ کرنل افسر الملک نے ان کو فوجی تعلیم دی اور نشانہ اندازی، شعبہ سواری، پریڈ اور فوجی کرتبوں کی خوب مشق کروائی۔ ان کے والد میر محبوب علی خان کے ہمراہ بچپن ہی سے سیر و سیاحت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ چودہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ کلکتہ پہنچ کر وائسرائے ہند سے ملاقات کی۔ اس کے اور ۱۹۰۳ء میں وہ دربار تاج پوشی شاہ ایڈورڈ ہفتم میں شریک تھے۔

نواب میر عثمان علی کی شادی ۱۹۰۶ء میں نواب جہانگیر جنگ کی لڑکی سے ہوئی جو دولھن بادشاہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ دولھن پاشاہ شاعر بھی تھیں اور ایجاز تخلص کرتیں۔ ان کے بطن سے شہزادہ اعظم جاہ شہزادہ معظم جاہ اور ایک دختر احمد النساء شہزادی پاشاہ تولد ہوئے۔

نواب میر عثمان علی خاں ۲۹ اگسٹ ۱۹۱۱ء میں اپنے والد نواب میر محبوب علی خان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔

تخت نشین ہوتے ہی کچھ عرصہ تو راست انتظام سلطنت کو سنبھالا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے باب حکومت کو تشکیل دی۔ نواب میر یوسف علی خاں۔ سالار جنگ، سرعلی امام، مہاراجہ کرشن پرشاد، سر اکبر حیدری، حافظ نواب احمد سعید خاں، آف چھتاری اور سر مرزا اسمٰعیل یکے بعد دیگرے صدر اعظم رہے ۱۹۳۷ء میں دستوری اصلاحات نافذ کئے اور مجلس مقننہ قائم کی۔ حکومت کے ہر شعبہ پر بذات خود نگرانی رکھتے تھے۔ میر عثمان علی خاں کے زمانے میں ملک کی ہر جہتی ترقی سیاسی اور سماجی اصلاحات نظم و نسق خوبی اور رعایا پروری کی متعدد کیفیتوں سے یہ ظاہر ہے کہ سلطان العلوم کی علمی سرپرستی کا مظہر شہرہ آفاق

جامعہ عثمانیہ اور اس کا ملحقہ ادارہ دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کی متعلقہ وہ عمارتیں ہیں جن میں مختلف ادوار کے تعمیری مذاق کا امتزاج اور فن تعمیر کا کمال بھی ہے عثمانیہ جنرل ہسپتال، عثمانیہ میڈیکل کالج، صدر شفاخانہ یونانی، مدرسہ طبیہ یونانی کی اونچی اونچی عمارتیں ملک کی ہر جہتی ترقی کے ساتھ ساتھ فن طب پر ان کی شخصی توجہ کی مادی شہادت ہے۔

باب حکومت کا مقام، نئی کابینہ کی تشکیل، نظام ساگر عثمان ساگر وغیرہ۔ پالسرفتح نگر پوچارم کا تالاب اور ویسے ہی خزانہ آب کی تعمیر زراعت کی ترقی کسانوں کو لگان کی معافی، جنگلوں کا تحفظ، آبکاری کا انتظام جاگیرات کی اصلاح اور تعلقات میں دفتروں، مدرسوں، دواخانہ، مسافرخانوں اور سینکڑوں عمارتوں کی تعمیر ملک بھر میں سڑکوں کا جال، چھوٹی بڑی پٹریوں پر پُل، ریلوے کی توسیع صنعت و حرفت کی ترقی انجمن ہائے امداد باہمی، اسٹیٹ بنک، کواپریٹیو بنک کا قیام، کرنسی نوٹوں کا رواج عثمان شاہی ملز، شاہ آباد، سمنٹ فیکٹری، بودھن شوگر فیاکٹری، سرپور پیپر ملز۔ سینکڑوں آئیل اور رائیس ملز اور آرائش بلدہ وغیرہ میر عثمان علی خاں کی رفاہ عامہ کے کام ہیں۔

حیدرآباد پر پولیس آکشن کے وقت بڑے درد انگیز واقعات پیش آئے تھے۔ اس کے بعد سے حیدرآباد میں ایک انقلابی دور شروع ہوا۔ حیدرآباد پر پولیس آکشن کے بعد جب عثمان علی خاں کو چند سال کے لئے راج پرمکھ بنایا گیا تھا۔ اور اس کے بعد گورنری کا عہدہ پیش کیا گیا تو انھوں نے یہ عذر کرتے ہوئے اُسے قبول نہیں کیا کہ اپنے وسیع خاندان کی آئندہ زندگی کے لئے انتظامات

اعلیحضرت میر عثمان علی خاں بہادر
آصف سابع

کرنے کی بھاری ذمہ داری دامن گیر ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس ضمن میں تیس کروڑ روپئے کی کثیر رقم خرچ کرکے اپنی اولاد اور احفاد کے لئے ہی نہیں بلکہ کئی اہم ٹرسٹیس بناکر وہ کارہائے نمایاں انجام دیا۔ جس کی مثال آج کی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی منظوری حاصل کرکے اپنے اپنے پوتے نواب میر برکت علی خاں مکرم جاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ جو ایک تعلیم یافتہ اور مدبر انسان ہیں۔ نواب میر برکت علی خاں دنیا کے چودہ ملکوں کی شہرت کے مالک ہیں۔ مکرم جاہ پرائویٹ اسٹیٹ آف نظام کے ضروری انتظامات کے علاوہ بر اعظم آسٹریلیا کے ملک التجار اور بے تاج کے بادشاہ ہیں۔ وہ منظاہرہ زندگی گزار رہے ہیں اور صاحب اولاد ہیں۔ ان کے بھائی مفخم جاہ بھی حیدرآباد میں عوام کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔

شاہ عثمان نے علم سے بھرپور پیار کیا اور حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ قائم کیا۔ انھوں نے اپنے لئے یا کسی فرد واحد کے لئے کوئی عیش گاہ کوئی تاج محل مقبرہ یا قلعہ نہیں بنوایا بلکہ سارے انسانوں کے لئے ایک معمر انسان درسگاہ تعمیر کروائی۔ جامعہ عثمانیہ کو دنیا کا نواں عجوبہ کہیں تو بجا ہوگا۔

انھیں اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی اور روزآنہ بلاناغہ ان کے سلام کو کنگ کوٹھی سے پرانی حویلی جایا کرتے تھے جب وہ بستر مرگ پر تھیں تو آدھی آدھی رات کو اور دن میں دو تین بار ماں کی تیمارداری بذات خود کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یادگار کے طور پر مادر دکن تعلیمی فنڈ قائم کیا اور عزاخانۂ زہرہؑ کے نام سے ایک شاندار عمارت بنوائی جہاں مرجع علم ہمیشہ

استفادہ رہتے ہیں۔ اور محرم میں دسں روز تک وہاں باقاعدہ عزاداری
ہوتی ہے جس میں تاحیات دسویں دن وہ شریک مجلس رہتے تھے۔ عزاخانہ
زہرہ کے لئے دو لاکھ روپیے کا ٹرسٹ قائم کر دیا تاکہ عزاداری ہر سال جاری رہے
وہ پانچ دن میں تیز بخار میں مبتلا ہو کر بروز جمعہ ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ
۲۴ جنوری ۱۹۶۷ء میں انتقال کر گئے جس کا حیدرآباد میں تین روز تک
سوگ منایا گیا۔ نیز عثمان علی خان کی تخت نشینی کے وقت ملک کے نظم و نسق
مالی اور سیاسی حالات اصلاح طلب تھے۔ مذہبی اور سماجی تقاریب کے
موقع پر بعض ناپسندیدہ باتیں جو رائج ہو چکی تھیں ان کو قانوناً ممنوع قرار دیا
گیا۔ تعلیم کو عام کیا گیا اور تعلیم نسواں کو اہمیت دی گئی۔ میر عثمان علی خاں
اپنے افسانوی تمول اور شاہانہ شان و شوکت کے باوجود ایک درویش سیرت
انسان تھے انھیں ورثہ میں جو دولت ملی اس میں وہ مسلسل اضافہ کرتے رہے
حالات کے بدل جانے پر اپنی جاجتھا کو کئی قانونی ٹرسٹوں کی شکل میں قائم
کرکے اپنے افراد خاندان کے علاوہ عام انسانی برادری کے حق میں اتنا بڑا احسان
کیا جس کی مثال نہ تو خاندان آصفی میں ملتی ہے اور نہ سینکڑوں دیسی ریاستوں
میں۔ آصف جاہ اوّل نے سلطنت آصفیہ قائم کی تھی مگر ان کے جانشینوں میں
میر عثمان علی خاں نے جدید اصولوں پر ریاست کو ترقی دے کر ملک کی تصوف
میں اُسے شریک کرکے اپنا اختیار و اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کر دیا۔ وہ
ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ان کے بہت سے کارناموں کی بدولت انکے جلوس
جنازوں میں لاکھوں افراد شریک رہے۔ اور کیوں نہ رہتے جبکہ ایسا انسان نہ تھا

عثمانیہ یونیورسٹی آرٹس کالج

دُنیا سے اُٹھ گیا جو حاکم وقت بھی تھا اور انقلاب زمانہ سے آخری وقت تک اپنے آپ کو ایک شہری سے زیادہ تصور نہیں کیا۔

حیدرآباد کا معاشرہ

انسانوں کے آپس میں مل جل کر رہنے کو معاشرت کہتے ہیں جسے رہنے سہنے کا طریقہ یا طرز زندگی بھی کہتے ہیں اور یہی طرز زندگی معاشرہ کہلاتی ہے۔

ہمارا معاشرہ نہ خالص مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور نہ محض ہنود یا کسی اور قوم کا بلکہ سبھی قوموں کا ملا جلا معاشرہ ہے جو اپنی گنگا جمنی تہذیب کا حامل ہے ہندوستان میں داخل ہونے والے مسلمان کسی ایک مقام کے باشندے نہیں تھے بلکہ شمالی ہند کے لوگوں کو مغلوں اور خلجیوں نے اسلامی تہذیب سے روشناس کیا (جو وسطِ ایشیا سے وارد ہند ہوئے تھے) جنوبی ہند میں یہ کام عرب تاجروں نے انجام دیا۔ اس طرح ہندوستان میں جب مختلف قومیں آباد ہوئیں تو ان سب کے میل ملاپ سے جو تہذیب عالم وجود میں آئی اُسے ہم ہندی اسلامی تہذیب سے موسوم کر سکتے ہیں۔ قومی تہذیب کا تیار شدہ ڈھانچا ہمارے حق میں ایک خداداد نعمت ہے جس کی حفاظت کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

ہندوستان کا معاشرہ ہمیں یہ گر بتاتا ہے کہ علم کسی ایک فرد یا قوم کی میراث نہیں بلکہ سب کے فائدے کی چیز ہے جس سے انسانی برادری کو مستفید ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

رہن سہن

جہاں تک رہائشی مکانات کا تعلق ہے ہمارے امراء یا متوسط درجہ کے افراد یا ادنیٰ طبقہ کے لوگ سب کے سب ایک دوسرے سے قریب رہنا پسند کرتے تھے امراء کی دیوڑھیاں بڑی بڑی اور شاندار ہوتی تھیں اس کے روز امراء کی ذاتی فوج نوکر چاکر، گھوڑوں کا اصطبل، جلوخانہ اور خانہ باغ وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھیں۔

دیوڑھیوں کا باب الدخلہ اتنا بڑا ہوتا جس میں سے ہاتھی بہ آسانی گذر سکتا۔ ان دیوڑھیوں کی اونچی اونچی کرسیاں مغل طرز پر تعمیر کے ستونوں اور کمانوں کے کئی دالان، کمرے، بالاخانے اور برآمدے ہوتے اور ستہ نشین اتنے وسیع اور عریض ہوتے کہ وقتِ واحد میں سینکڑوں آدمی وہاں سما جاتے اور جلوخانہ اس حصہ کو کہتے تھے جو ہر دیوڑھی کے سامنے ہوتا۔ باب الداخلہ کے اوپر نوبت خانہ ہوتا جہاں جہاں صبح و شام دو پہر سہ نوبت بجائی جاتی تھی

اوسط درجہ کے مکانات بھی اسی رنگ اور اسی طرز تعمیر کے ہوتے تھے۔ البتہ غریب عوام کے مکانات کچے اور مٹی کے ہوتے تھے جن میں روشنی اور ہوا کا مشکل سے گزر ہوتا تھا۔ جن کے چھت کویلو کے ہوتے تھے اور گھروں میں محراب اور چراغ دان بھی ہوتے تھے۔

امرا یا کی دیوڑھیاں یا اوسط درجہ کے مکانات میں پردہ کی دیوار

باب الداخلہ کے سامنے ضرور ہوتی تھی۔ کیونکہ مسلم خواتین پردہ کی سختی کے ساتھ پابند تھیں۔ یہاں تک کہ اپنی آواز نامحرم کو سنائی بھی نہ تھی۔

اوسط درجہ کے مکانات دو دو تین قطعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ جن کی منجملہ ایک قطع زنانے کے لئے مختص ہوتا تھا۔ اور اسے زنانہ خانہ کہتے تھے۔

مملکت حیدرآباد میں نہ صرف بلدہ بلکہ اضلاع میں بھی آب رسانی کا کا انتظام بہت اچھا تھا۔ عوام کو کبھی پانی کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ بلدہ حیدرآباد کے ہر گھر میں باؤلی تھی۔ کہیں کہیں پانی کے جھرے بھی نکل پڑتے تھے۔ اگر پانی سیندھتے وقت غفلت سے ڈول کنویں میں گر جاتا تو پڑوسی کا ڈول مستعار لیا جاتا تھا۔ ڈول نکالنے والے گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے۔ "ڈول نکلوالو" جن مکانوں میں باؤلیاں نہ ہوتیں وہاں کمہار اور بھشتی پانی مہیا کرتے تھے۔ بھشتیوں کو خواجہ میاں سے مخاطب کرتے تھے۔ کمہار ٹین کے ڈبوں میں پانی لاتے تھے۔

بلدہ حیدرآباد میں جوں جوں نلوں کی تنصیب کی گئی۔ کنوں کا استعمال کم ہوتا گیا۔ بعد میں مشہور کنویں اور کنویں بھی ویران ہوگئے۔ کنوں کو میں باؤلی کہتے ہیں۔ حیدرآباد کی باؤلیوں میں ہری باؤلی، نگر کی باؤلی، دودھ باؤلی، اور گوندکی باؤلی، موسیٰ باؤلی اور جڑاواں حوض، میر عالم کا تالاب، میر جملہ کا تالاب، حسین ساگر، حمایت ساگر، حسین ساگر، عثمان ساگر یہ سب حیدرآباد کے مشہور تالاب ہیں۔

میر عالم کے تالاب کے راستہ میں رکن الدولہ کا چشمہ ہے جو ہم کے نام سے

موسوم ہے۔ اس چشمے کا پانی ٹھنڈا، نہایت شیریں اور بہت ہلکا ہوتا ہے غذا کو بہت جلد ہضم کرتا ہے اس چشمے کا پانی تانبے کے گھڑوں میں رکھ کر اس کو کارٹوں کے ذریعہ کنگ کوٹھی لایا جاتا تھا۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علیخاں یہی پانی پیتے تھے۔ اعلیٰ حضرت جب کبھی مملکت سے باہر جاتے تو ریل کے ذریعہ ان کو پانی بھیجا کیا جاتا تھا۔ بی بی کے چشمے کا پانی بھی نہایت عمدہ اور میٹھا ہوتا ہے

اہل شہر کی زندگی پیشیوں کے لحاظ سے ہوتی تھی جو جاگیر اور منصب کے مالک تھے۔ نظم جمعیت سے امتیازی تنخواہ انھیں ملتی تھی جمعداری کی بڑی ہموار راستے تھے ان کی ذمہ داری ورسمی تھی۔ بڑے آرام کی زندگی گذارتے تھے آٹھ نو بجے نیند سے بیدار ہوتے۔ نوکر چاکر انھیں اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتے تھے۔ صبح کے سلام کی بڑی اہمیت تھی۔ صبح اٹھتے تو گھر کے سب چھوٹے اور نوکر صاحب خانہ دار بیگم صاحب کو آداب بجالاتے۔ یہ رواج اوسط گھرانوں میں بھی تھا۔ تمام ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتے اس وقت تک ۱۰ یا ۱۱ بج جاتے۔ اس لحاظ سے دوپہر کا کھانا ۳ یا ۴ بجے ہوتا۔ اور رات کا کھانا رات کھاتے تھے، جو سد شطرنج، مغلانی گنجفہ کھیلتے۔ عورتیں اور مرد دونوں بھی پچیسی کھیلتے اور شطرنج بچے ست گھوڑا بھی کھیلتے۔ ننھی بچیاں گڈا گڑی کی جھوٹ موٹ دنیا میں مصروف اور ننھے بچے لکڑی کا گھوڑا چلاتے رہتے۔ ریتی میں گھروندے بناتے۔ بالکل چھوٹے بچے اور بچیاں بھی کھیل کود جس میں اپڑی کی توبڑی، بھائی بتو اور آنکھ مچولی ہوتی۔ لڑکیاں اور بچیاں گڈا گڑی کی شادی کرنے میں مصروف رہتے مہمان آتے خاطرداری ہوتی۔ سب بچے مل کر پکوان بھی کیا کرتے

اسے ہنڈکلیاں کہتے تھے۔

رات ہوتے ہی بچے سب مغلانی کے اطراف جمع ہو جاتے۔ پیاری پیاری کہانیاں کہی جانے لگتیں۔ بچے فرمائش کرتے۔ بستر ڈالے جاتے صاف ستھرے بستر پر کہانیاں سنتے سنتے سو جاتے

صاحب خانہ کو ہر وقت مصاحبین گھیرے رہتے۔ بڑے آرام کے عادی تھے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنا خلافِ شان سمجھتے تھے۔ ملازمین کے بغیر وہ ہل چل بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ہر کام میں ملازمین کی محتاجی۔ بیت الخلا جائے تو نوکر پانی رکھ کر دروازے کے باہر کھڑا رہتا۔ جب وہ منہ دھوتے اس وقت چاندی کی تھالی زیر انداز میں رکھ کر صابن آئینہ وغیرہ سامنے رکھ کر کھڑے رہتے جب منہ دھو چکے تب تو الیہ دیا جاتا۔ کنگا ہاتھ کو دیتے۔ دسترخوان بچھا رہتا۔ کھانے پر بچے انتظار کرتے رہتے۔ سب ملکر کھانا کھانے کا رواج تھا چائے پینے کا رواج نہیں تھا۔ بڑے لوگ کھانے کے بعد پان کھاتے تھے۔

ملازمت پیشہ تاجر، اہل صنعت وحرفت مزدور اور چھوٹے طبقے کے لوگ محنتی تھے۔ صبح جلد جلد اٹھتے کھا پی کر اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے تھے اور دن بھر اسی میں لگے رہتے۔ مگر اونچے طبقے کا اثر دوسری طبقوں پر پڑا یہ لوگ بھی اپنی آمدنی کا کچھ حصہ سیندھی خانہ میں اڑا دیتے۔ سیندھی کے عادی تھے کہتے تھے کہ سیندھی دن بھر کی تھکن اتار دیتی ہے اوسط اور بڑے گھر کی عورتیں اس سے قدرے بچی ہوئی تھیں مگر پھر بھی محلات میں اس کا دخل تھا۔ بعض ڈیوڑھیوں میں سیندھی راتب مقرر تھے اچھے اچھے لوگ

رتھوں شکراموں، جھٹکوں میں اور گھوڑوں پر سوار ہوکر سیندھی خانہ پہنچ جاتے نشہ میں چور وہیں بیٹھ کر جو شہر سے دور ہوتے۔ مٹی کا گوشت، بھونی کلیجی پاکنہ کھاتے، میلے ٹھیلے عرس اور جاترا میں یہ چیزیں خوب ہوتے۔

اس کے ساتھ ساتھ زاہد اور پرہیز گار بھی تو شہر میں تھے۔ سیندھی اور شراب نوشی کثرت کے باوجود نماز کے پابند قرآن شریف اور وظایف کے پڑھنے والے پابندی سے پوجا پاٹ کرنے والے رام رام جپنے والے بھی رہتے۔

حیدرآباد کے معاشرے اور رکھ رکھاوے جو یہاں کی تہذیب کا آخری نمونہ کہا جاسکتا۔ ایک جاگیردارانہ معاشرہ تھا جس میں ایک خانوادہ کی حکومت تھی۔ لیکن نظام ہو یا جاگیردار سب روایت کی ایک سنہری ڈور میں بندھے ہوئے تھے ان کے اطراف حصار نہیں تھے۔ جو ان کے نچلے طبقوں کو ان سے الگ کر دیتے۔

تعلیم عام نہ تھی لیکن عام طور پر لوگ باشعور تھے۔ کم و بیش ہر اوسط گھر میں ایک کتب خانہ ہوتا۔ ایسے افراد کی بھی کمی نہیں تھی جو نوادرات جمع کرتے۔

خاندان پائیگاہ کا مرتبہ شاہی خاندان کے بعد سب سے بلند تھا۔ یہ دونوں خاندان آپس میں ازدواجی رشتوں کے ذریعہ بھی دوسرے سے منسلک تھے۔ امرائے پائیگاہ میں سخاوت اور اعلیٰ ظرفی کی خصوصیات تھیں۔ والیٔ ریاست کے خدمات ہی میں نہیں بلکہ ریاست کے عوام کی فلاح و بہبود اور ان کی خوشحالی اور ترقی کے لئے بھی اپنی کوششوں کو انھوں نے جاری رکھا۔ امرائے پائیگاہ بھی وسیع القلب، انصاف پسند اور غریب پرور تھے۔

ثقافت میں تعمیر عمارات کا شوق لازمہ دولت اور امارت تھا۔ اس کا

اثر حیدرآباد میں موجود تھا۔ قطب شاہی دور کے بعد ایران کی طرز تعمیر، محلات شاہی اور پبلک عمارات میں مساجد اور مقابر دارالشفاء، تالاب، حوض ذرائع آبپاشی وغیرہ کا سلسلہ ایک صدی تک معدوم ہو گیا تھا۔ لیکن جب شاہان آصفیہ کی حکمرانی میں امن و عافیت کا دور آیا تو پھر عمارات کی طرف توجہ کی گئی۔ تو پنج محلہ، پرانی حویلی اور دیگر ایوانات شاہی کے ساتھ ساتھ میر عالم، مہاراجہ چندو لال، شمس الامراء اور دیگر امراء کے اس وقت کی طرز تعمیر کے مطابق اپنے محل اور دیوڑھیاں اور باغات بنوائے جنھیں دیکھ کر ایک قلم کار ان سب کی طرز تعمیر، ضرورت اور آسائش اور اس زمانے کی ثقافت و تہذیب پر کافی روشنی ڈال سکتا ہے۔ مہاراجہ چندو لعل کی دیوڑھی اور بارہ دری مشہور رہے۔

امراء کے شوق کی چیزیں:

حیدرآباد میں اسلحہ رکھنے کا شوق امراء ہی سے لیکر عوام تک تھا۔ اس لئے ہر امیر گھرانے میں اسلحہ کا کافی ذخیرہ جمع رہتا تھا۔ وہ اسلحہ کے اتنے شوقین تھے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیش بہا معاوضہ دیکر بہترین اسلحہ خریدے جاتے تھے۔

شکار کا شوق بھی عام تھا پرانی ثقافت اور امارت کا لازمہ نفیس و قیمتی لباس بھی تھا۔ ہمہ اقسام کے زرین اور سوتی کپڑے جامہ وار شال و دشالے خوبصورت اور پائیدار بھی ہوتے تھے ہر امراء کی دیوڑھی میں بڑی افراط سے موجود رہتے جہاں تک ممکن ہوتا ان کی خرید و فروخت جاری رہتی۔ امراء کے پاس لباس کا بھی کافی ذخیرہ موجود رہتا تھا۔ اور پھر مغربی دور کی وجہہ سے لباس کا فیشن بدلتا چلا گیا۔

حیدرآباد کے امرأ

آرام دہ مشرقی لباس پر مغربی چست لباس کو ترجیح دی جانے لگی۔

ہر دیوڑھی میں فرش ہوتا، قالین، شیشہ آلات اور پرانی چینی کے برتن کانچ کے برتن اور آلات آہنی بے شمار رہتے۔

پہلے زمانے میں قلمی تصویریں بنائی جاتی تھیں لیکن بعد میں کیمرے سے فوٹو کھینچوائے جانے لگے۔ اپنے احباب میں تصاویر دینے کا رواج عام سا ہوگیا تھا۔ حیدرآباد کے مشہور اور موروثی فوٹوگرافر راجہ دین دیال کے نگار خانہ میں عہد غفران مکان اور اس کے بعد عثمان علی بادشاہ کے زمانے کی فوٹوگرافی موجود ہے فوٹوز کے علاوہ مونوگرام، کرسمس کارڈس، فاونٹن پن جمع کرتے اور کبھی کبھی افسر اپنے ماتحتین کو بھی دیا کرتے تھے۔

ابتدائی دور میں لوگوں کو سینما اور تھیٹر سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی بیرون ملک سے سرکس اور ناٹک کی کمپنیاں آتی تھیں اور ان کی نمائش کرکے واپس ہوجاتی تھیں۔

عموماً امارت اور دولت کے لارنے میں رنگین زندگی بھی آجاتی ہے رنگیلی زندگی کے متعلق یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ مذاق تسلیم میں اس کی ایک حد رکھی گئی ہے پھر سوسائٹی کا رواج اہل وعیال سب سے بڑھ کر مذہب وملت نے بھی ہمارے سامنے قیود اور پابندیاں عاید کردی ہیں۔ اگر اس کو نگاہ میں رکھا جائے تو زندگی منظم کہلاتی ہے مگر بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو غلطی کو غلطی سمجھ کر بھی اسے پھیلاتے ہیں لیکن اس سے عوامی زندگی میں بہت فرق پڑتا ہے۔

رنگین زندگی کا ایک اہم جز رقص وسرور سمجھا جاتا ہے صرف ہندوستان

ہی میں نہیں بلکہ باہر بھی تقریباً ہر شخص موسیقی سے دلچسپی رکھتا ہے اکثر گھروں میں رقص اور سرور کی جہارت کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ عموماً دعوتوں کا لوازمۂ رقص تو تہذیب کا ایک جز قرار دیا جاتا ہے۔ سابقہ تہذیب و ثقافت میں امراء اور اہلِ دولت موسیقی اور رقص کے رموز و نکات کو فنی طور پر مانتے تھے اور اس کا عملی کام طوایفوں اور قوالوں پر منحصر تھا۔ تقاریب میں قوالی اور رقص وسرور کی محفلوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ رواج امارت کی بدولت عام تقریبات میں ہمنشیں احباب خاص کی دعوتوں میں طوایفوں، قوالوں اور بھانڈوں کو بھی بلایا جاتا تھا جس قدر بڑی تقریب ہوتی ارباب نشاط کی محفل میں بھی انھیں مناسبت سے ارباب نشاط کو بلایا جاتا۔ حسن پرستی کے تقاضے سے بعض عیش پرست حضرات دائرہ اعتدال سے تجاوز کر جاتے۔ بعض امراء رنگیلی زندگی کی تلاش میں اپنے نام غریبی عزت اور دولت کو خیرباد کہہ دیتے تھے۔

حیدرآباد کی رہن سہن اور عام ثقافتی حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کا ہر قبیلہ یا خاندان خود مکتفی تھا۔ پہلے خانہ باغ ہوتے تھے جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی اور شہر وسیع تر ہوتا گیا۔ دیوڑھیوں کے خانہ باغوں کے علاوہ عوام کے لئے پبلک پارکس وجود میں آئے۔ حیدرآباد کا سب سے قدیم اور بڑا باغ باغِ عام تھا جو اب بھی قابلِ دید ہے۔ علاقہ صرف خاص میں بھی بڑے بڑے باغ تھے تجارتی اغراض کے لئے بھی باغ لگائے جاتے تھے تب ہی اس زمانے میں میوہ کی افراط تھی۔ امرائیوں میں آم کے باغ زمین داروں اور امراء کی ملکیت تھی۔ حیدرآباد میں سینکڑوں قسم کے آم ہوتے تھے۔ پارکس کے

آعظم جاہ بہادر فوجی سلامی لے رہے ہیں
نواب صاحب مکلا سلطان نواز جنگ کے بازو عالیجناب محمد اسمٰعیل کمشنر صاحب کھڑے ہیں

جام مشہور ہیں۔ سیتا پھل کے خورد رفت بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔

سیر و تفریح : شہروں کی زندگی میں بہت تصنع اور تکلف ہوتا ہے۔ خود بخود جی چاہتا ہے کہ ہم شہر سے دور جا کر چند روز کے لئے فطرت کے سادہ اور خوشگوار مناظر کا لطف اٹھائیں۔ حیدر آبادی لوگ اکثر سیر و تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں۔

لباس چوڑیاں اور سنگھار

کئی برس پہلے حیدرآباد میں جو لباس پہنے جاتے تھے وہ زرّین اور مصالحہ دار ہوتے تھے۔ جو لوگ قیمتی لباس پہنتے ان کی بڑی قدر ہوتی تھی بڑے گھرانے کی لڑکی کو بیاہ کرنا ہی بڑی عزت سمجھی جاتی تھی۔

فطرت کے اس حسین عطیے کو جسے حسن اور خوبصورتی کہتے ہیں پرانے زمانے میں کچھ اور ہی مقام دیا گیا تھا۔ پرانے زمانے میں عورت نہ صرف اپنے شوہر کی محکوم ہوتی تھی بلکہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن امور خانہ داری کی حد تک وہ گھر کی ملکہ ہوتی۔ خواتین کی بات کو حالانکہ کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن پھر بھی عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ عورتیں مردوں کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ حیدرآباد دکن میں زمانے قدیم میں مردوں کے بننے سنورنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ہر عورت میں بننے سنورنے اور اپنے حسن کو نکھارنے کا فطری ذوق پایا جاتا ہے۔ اور قدرت کی اس دین عورت اپنا حق سمجھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ اس کا لباس جامہ زیب ہو۔ یہ

مشہور مثل ہے "کھانا آپ بھاتا۔ پہننا جگ بھاتا" پہلے زمانہ میں نہ تو میک اپ کا وہ سامان تھا اور نہ لباس میں وہ ندرت تھی۔ لیکن پھر بھی لوگ سلیقے اور طریقہ کا لباس پہنتے۔ عورتیں سیدھی مانگ نکالتی تھی۔ چوٹی کو خوبصورت زیور سے سجایا جاتا تھا۔ ربن اور ٹائی لگائی جاتی تھی۔ لمبے لمبے چھڑی دار بال کی بڑی اہمیت تھی۔ تقاریب اور عیدوں کے موقعوں پر عورتیں اور بچیاں اپنی مانگ میں اراش یا افشاں بھرتیں۔ آنکھوں میں کاجل ہر وقت رہتا۔ چنے کے بیسن اور جواری کے آٹے سے منہ دھوتی جبکہ صابن کا رواج نہ تھا۔ ہلدی کی ملوٹ بھی ہوتی۔ عورتیں اسکا کائی، ریٹے املی کے اٹکل سے منہ دھوتیں۔ سر میں ہر وقت تیل رہتا۔ روکھے بال رکھنا یا بال کھلے رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں میں موٹے یا دبلے پن اور آرضی خوبصورتی کا اتنا احساس نہ تھا۔ قیمتی اور وزنی کپڑے اور زیور استعمال کرتے تھے۔

حیدرآباد کی خواتین اب گھر کی چاردیواری سے نکل کر میدانِ عمل میں کود پڑی ہیں۔ سماج میں مختلف مذاہب کے لوگ مرد اور عورتیں یکساں ایک محفل، اسکول کالج اور دواخانوں اور تفریح گاہوں اور تھیٹر نہ۔ بس آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں اب عورتیں بھی آرام اور سہولت کا سفر اختیار کرتی ہیں، اسلئے کہ ہماری مشترکہ تہذیب ترقی کی راہوں میں گامزن ہے۔ لباس کو موسم کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں۔ آجکل ایسا لباس پہنا جا رہا ہے جو اچھا ہو آرام دہ ہو اور وہ فیشن کے لحاظ سے بنا ہو۔

آجکل فیشن پرست طبقہ ہی نہیں بلکہ بڑے اور چھوٹے سب ہی ایک ہی

قسم کا لباس پہنتے ہیں۔ فرق اب صرف قیمت کا رہ گیا ہے۔ آج کل اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ آرائش اور زیبائش سلیقے سے کی جائے تاکہ وہ سب کی نظروں میں جامہ زیب اور دلکش معلوم ہوں۔ اب تو یہاں کی خواتین بیوٹی پارلر کو جاتا کرتی ہیں۔ آجکل کی عورتوں اور لڑکوں میں ہی نہیں بلکہ لڑکوں اور مردوں میں بھی صحت اور خوبصورتی کو برقرار رکھنے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے پھر بھی بعض لوگ جو قدیم ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں ابھی بھی انھوں نے اپنی پرانی روش کو نہیں چھوڑا۔ آج کل جسم اور چہرے کو سنوارنے کا رواج بھی عام ہوگیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قدرتی حسن کو آرائش اور زیبائش سے اور بھی دلکش بنایا جاسکتا ہے۔

آج کل دولھنوں کے میک آپ بھی ہورہے ہیں۔ پرانے زمانے میں یہاں ایسا رواج نہیں تھا۔ آج کل مرد یا عورتیں چہرے کی ساخت کے لحاظ سے میک آپ کرتی ہیں۔

شخصیت کو موثر بنانے میں لباس کو بڑا دخل ہے۔ حیدرآبادی تہذیب کا معیار یہاں کی زبان، غذا، رہائش کے طریقوں کے علاوہ یہاں کے لباس سے بھی پرکھا جاتا ہے۔ یوں تو حیدرآباد میں مختلف ممالک کے لوگ آباد ہونے کی وجہ سے یہاں ہندوستان کے ہر حصے کے لباس کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً پنجابی، مدراسی، گجراتی، بنگالی وغیرہ مگر حیدرآباد کا لباس خاص تھا۔ قوموں کی معاشرت، تمدن اور تہذیب کے مدارج لباس میں مضمر ہوتے ہیں ہمارے ہندوستان میں بسنے والے ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی سب ہی

قوموں کی عورتیں ساڑی میں ملبوس ہوتی ہیں۔ اس طرح ساڑی ہندوستانی عورت کا قومی لباس ہے خواتین اور بڑی عمر کی لڑکیاں یہاں ساڑی ہی پہنتی ہیں۔ لڑکیاں کرتے پاجامے اوڑھنیاں پہنتی ہیں یا پھر شرٹ شلوار اور اوڑھنی بچیوں کو فراک پہنائے جاتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں راجپوت عورتیں لہنگے اور دامن کا استعمال کرتیں اور گھونگھٹ نکالتی تھیں۔ مسلمان عورتیں کرتی چولی، کلی دار پاجامہ اور چھ گز لانبے ڈوپٹے پہنتی تھیں۔ ہندو عورتیں چولی اور ساڑی ہی پہنتی تھیں۔ البتہ ساڑی معمولی کھادی، سوتی، ریشمی یا زرین ہوتی۔ بعد کو مسلمان خواتین بھی یہی لباس پہننے لگیں۔

بچوں کے لباس میں ململ یا چکن یا کارگے کے کرتے، بنیین، سفید ہرک کے پاجامے ہوتے۔ سر پر ٹوپی ضرور پہنائی جاتی تھی۔ مرد بچوں کو رنگین کمخواب، مشجر، ہمرو، مشروع، سنگین اطلس کی شیروانی، ویسی ہی دستار یا گول ٹوپی۔ کرتا اور چوڑی دار پاجامے تقاریب اور مہمانی کے موقعوں پر پہنائے جاتے۔ عام دنوں میں کرتے پاجامے اور ٹوپی کے ساتھ ساتھ خوبصورت صدریاں بھی مرد بچوں اور عورت بچیوں کو پہنائے جاتے تھے۔ بچوں کے سر پر کارچوبی ٹوپی ہوتی بچیوں کو بھی کوڑلے ڈالکر سر پر خوبصورت زرین ٹوپیاں پہنائی جاتی تھیں۔ عورتوں کو سر پر پلو ڈالنا لازمی تھا۔ کھلے سر رہنا معیوب بات تھی۔

پرانے زمانے میں حیدرآباد میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی بیگمات اور دولت والے امیر امرا زرق برق لباس پہن کر اپنی بڑھیا پوزیشن کی نمائش کرتے تھے یہ لباس اتنا وزنی ہوتا تھا کہ اس کے پہننے سے عورتیں بار محسوس کرتی تھیں۔

آصف جاہی دور میں وہی لباس قیمتی کہلاتا تھا جس پر قیمتی مسالا لگایا جاتا۔ یہ لباس آرام دہ نہ تھا۔ اس قسم کے لباس کو پہن کر ایک دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا تھا مگر لوگ اس قسم کے لباس کا پہننا ضروری سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے انکی شان اور اسا

خواتین کے اوڑھنے کے لباس میں سب سے شاندار اکلائی تھی چھ گز کی کھیوے یا تاربانے کی زرین ساڑی پر بالشت دو بالشت چوڑا مسالا ٹانکا جاتا تھا پھر چوحاشیہ پھر بنارسی ساڑی یا ریشمی یا زری کے کام کی ساڑی یا پھر کامدانی، جابدانی کے کام کی ہوتی یا پھر چمکی (ستارہ) ٹکی ہوئی ساڑیاں ہوتیں۔ گھروں میں پہننے کے یا تو اڑے ڈوپٹے ہوتے جس کو اکثر گھر ہی میں رنگوایا جاتا ابرک دی جاتی، کلف دے کر اس کو چنتے تھے اور مغزی ٹاک کر اوڑھتے تھے۔ کارگے، جالی یا چکن کی کرتی اور چوئی پہنتے تھے۔ گھروں میں ہمرو مشروع یا سنگین یا پوتھ کے اطلس کے پاجامے ہوتے۔ زرین مسالوں میں جو سنہری اور روپہری سلما ہوتا ستارا (چمکی)، کرن، گوکرو، چمپا، گوٹ فیتوں چکٹی مسالے کا پٹہ ہوتے۔ ان سب مسالوں کو نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ پہلے الگ کپڑے کے پتے پر ٹانک لیا جاتا پھر دوپٹے کے کناروں پر یہ تیار شدہ مسالا ٹانکا جاتا۔ کرتوں، ساڑیوں اور ڈوپٹوں کو کچے رنگوں میں رنگتے تھے۔ چوحاشیہ اور ساڑیوں کے نور جو مغمل کے کالے پٹوں پر گھر ہی کی عورتیں پوتھ اور ریشم کے رنگین دھاگوں سے تیار کرلیتی تھیں۔ چوحاشیہ جب تک لڑکیوں کی شادی نہ ہو پہنایا جاتا تھا۔ کرتنی پہننے کی اجازت انھیں دیجاتی تھی۔

خواتین ساڑیوں کے ساتھ بلوز پہنتی تھی۔ قدیم زمانے میں کرتے ہی پہنتے تھے۔

قطب شاہی دور میں مسلمان مرد عبا قبا (ڈھیلا ڈھالا جُھبہ تنگ آستین) کا اور نیم جامہ جو کبھی تنگ اور کبھی گھیرے دار ہوتا پہنتے تھے۔ سر پر شملہ یا دستار ہوتی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنا تاتاری (ایرانی) لباس چھوڑ کر ململ کا کرتا ڈھیلا پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں جڑاوی کڑے پہن رکھے تھے۔

قدیم زمانے میں حیدرآبادی ہندو مرد دھوتی اور قمیص پہنتے تھے مسلمان مرد کرتے یا قمیص اور پاجامے استعمال کرتے تھے۔ حیدرآباد کی شیروانی دنیا بھر میں مشہور رہی ہے یہ لباس مسلمان، ہندو اور سکھ حضرات بھی زیب تن کرتے تھے سرپوش میں شملہ یا عوامی یا فوجی طرز کی پگڑی باندھتے تھے۔ دیسی عیسائی یوروپین سوٹ پر ہیاٹ لگاتے تھے پارسی ڈگلے پر بانات کی ٹوپی پہنتے تھے بعد میں رومی ٹوپی پھُنے کی بھی جانے لگی۔ شہری ہندو پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ اور دیہاتی مسلمان دھوتی باندھتے تھے۔ اگلے زمانے میں سینکڑوں ہندو مرد منصبداری پگڑی ہی پہنتے تھے۔ سینکڑوں دیہاتی مسلمان بے تکلف دھوتی ہی باندھتے تھے۔ علماء اور مشائخ عبا یا قبا پہنتے اور سر پر عمامہ باندھتے تھے۔ عوام انگرکھا اور پاجامہ پہنتے تھے۔ اور سر پر رنگین شملہ باندھتے۔ تین چار ہاتھ کے رومال کا جوڑا ان کے بغل یا کاندھے پر ہوتا۔ ادنیٰ درجہ کے ملازمین یہ رومال کمر سے باندھتے۔ شاہی درباروں میں منصب داری پگڑی اور اپنے رہنے خاندانوں کی دستار پہنی جاتی تھی۔ اور بگلوس لگانا لازمی تھا۔ وزیروں اور اونچے درجے کے امراء کے سامنے

بھی پگڑی اور بگلوس کے بغیر کو جا نہیں سکتا تھا۔ سرکاری دفاتر اور خاص کر عدالت میں وکیلوں کے لئے پگڑی پہننا لازمی تھا۔ وکیلوں کیلئے پگڑی لازمی تھا۔

شیروانی بھی ہمارے قومی لباس میں شامل ہے۔ شیروانی کی کاٹ پہلے پہل تو انگریزی کوٹ اور مغلائی انگرکھے سے مشابہ ہوتی تھی۔ پہلے شیروانی میں سات بٹن لگائے جاتے تھے اب چھ بٹن استعمال ہوتے ہیں اور آستینوں پر بٹنوں کا اب فیشن باقی نہیں رہا۔ رومی ٹوپی کا رواج عام تھا۔ بعد میں کرتے کی عوض قمیص استعمال ہونے لگے جس کے گلے پر شیروانی پہنتے وقت کالر بھی لگایا جاتا تھا قمیص کی جگہ بوشرٹ پہننے کا رواج بھی پڑ گیا۔ پرانے زمانے میں دوہر پاجامے پہننے جاتے تھے۔ اکہرے پتلون نما اور چست چوڑی دار پاجامہ عام طور پر پہننے جانے لگے۔ سوٹ، بل باٹم اور سفاری کا رواج عام ہو گیا۔ شیروانی شادی بیاہ تقاریب، عیدین یا جمعہ کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ ”حیدرآباد کی بریانی اور حیدرآباد کی شیروانی“ یہ فقرہ زبان زد خاص و عوام میں مشہور ہو گیا ہے۔ لباس میں بعد کو بڑی تبدیلیاں آگئیں تعلیم اور شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ اب حیدرآباد میں پرانے قسم کے لباس کا رواج باقی نہیں رہا۔ فیشن کے ساتھ ساتھ لباس بھی وقتاً فوقتاً بدلتے جا رہے ہیں۔ ہلکے رنگ کے لباس اور سوتی لباس کو ترجیح دی جاتی ہے مرد لوگ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان پیٹ، شرٹ، بوشرٹ سفاری وغیرہ پہنتے ہیں۔ اور گھر میں کرتے اور پاجامے پہنتے ہیں۔

پہلے مرد کھرڈاوین، آیا شاہی (یا پوتش شاہی) جوتے، پمپ شوز جرادیں جوتے

سلیپر یا جوٹ پہنتے تھے۔ آجکل یہاں مرد اور عورتیں سینڈل اور چپل پہنتے ہیں۔

اگلے زمانے میں پاتابوں کا استعمال لازمی تھا۔ اور شیروانی کے کالر کے ہک پابندی کے ساتھ لگائے جاتے تھے۔ لباس کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بالوں کا طرز بھی بدلا۔ مرد ڈاڑھی منڈوا کے مونچھیں رکھتے تھے اور رفتہ رفتہ ڈاڑھی اور مونچھوں دونوں کا صفایا ہوگیا۔ انگریز وائسرائے لارڈ کرزن کے عہد حکومت میں ڈاڑھی اور مونچھوں کا منڈوانا مغربی تعلیم یافتہ اور ان پڑھ دونوں میں عام ہوگیا۔

تقریباً سو سال پہلے مرد اپنا پورا سر گھٹوا لیتے تھے۔ اکثر برہمن پجاری جوٹو چھوڑتے تھے۔ بعد کو بال انگریزی طریقے سے بنائے جانے لگے۔ اور پچھلے سر کے بال کٹوائے جانے لگے ہر گھر پر حجام مقرر تھے گھر ہی پر لوگ حجامت کروا لیتے تھے۔ حیدر آباد میں مختلف حجامت خانے اور ہیر کٹنگ سیلون کھل گئے۔ لڑکیوں اور عورتوں کے بھی ہیر اسٹائیل بھی بنائے جانے لگے۔

خواتین میں ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی لگانے کی رسم بھی بہت پرانی ہے۔ اگلے زمانے میں یہ رواج صرف ہندوستان میں تھا باہر نہ تھا۔ ہندوستان سے باہر مہندی کی جگہ سرخ رنگ کا پینٹ ناخونوں پر لگایا جاتا تھا۔ ہندو لوگ پیشانی پر ٹیکہ یا بندی لگاتے ہیں یہ آرین کی ایجاد ہے سیندور ہندو عورتیں جو اپنی مانگ میں لگاتے ہیں۔ ان کی قدیم مذہبی چیز ہے شادی بیاہ کے موقعوں پر سیندور، کوکم، ہلدی، صندل (چندن) پان اور پھول کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے بھنویں بنانے کا رواج ملک چین سے ہندوستان پہنچا اور مغل بیگمات نے اُسے خاص طور پر اپنایا۔ کاجل انھیں بیگمات کی ایجاد ہے۔

چوڑیاں سہاگن اور بچیاں پہنتی ہیں۔ چوڑیاں، کالی پوتھ یا منگل سوتر سہاگ کی نشانی سمجھے جاتے ہیں

حیدرآباد ہی کیا سارے ہندوستان میں چوڑیاں، کالی پوتھ کو سہاگ کی نشانی ہی سمجھتے ہیں۔ پرانے زمانے میں چوڑیاں کانچ کے ساتھ ساتھ لاکھ کی بھی بنائی جاتی تھیں، لاکھ کی چوڑیوں پر سلما، ستارا چمکی، کٹوری، نگیں، پوتھ، موتی، ہنی اور رنگ دیکر بنایا جاتا تھا۔ طلائی کام کی رنگ برنگی چوڑیاں، ریشمی کانچ کی چوڑیاں خواتین گھروں میں پہنتی تھیں۔ تقاریب کے موقعوں پر چوڑی کے جوڑے پہنے جاتے۔

یہ خیال غلط ہے کہ چوڑیاں محکومیٔ نسواں کی نشانی ہیں۔ شاید یہی وجہہ ہے کہ آجکل کی خواتین چوڑیوں کا پہنا ترک کرتی جا رہی ہیں۔ عام طور پر اگر چوڑیاں ٹوٹ جائیں تو بدشگونی سمجھتے ہیں اسلئے چوڑی بڑھ گئی یا ہلکی ہو گئی کہتے ہیں ہمارے گلی کوچوں میں جب چوڑی والا آواز دیتا ہے "چوڑی بنگڑی گوٹ" تو یہ آواز سنتے ہی عورتیں اس کو طلب کرتی ہیں اور بڑے شوق سے چوڑیوں کا سودا کرتی ہیں۔ رنگین کانچ کی چوڑیاں منہ مانگے دام دے کر پہنتی ہیں، چوڑیاں پہن کر بڑوں کو سلام کرنے اور چوڑی والی کو نیگ دینے کا رواج تھا۔

حیدرآباد میں جوڑی کے جوڑے لاڈ بازار میں ملتے ہیں۔ یہاں کے چوڑی کے جوڑے دنیا کے ہر خطے میں مشہور ہیں۔ مسالے اور نگوں کے چوڑی کے جوڑے گوٹ، جواب، بچے آزو بازو اور بیچ میں منڈوا یا صرف سونا پالش ڈالکر تیار کئے جاتے ہیں۔ مسالے کے جوڑے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں جن میں بیل پات، کھوبرا کنگن

چمکی کٹوری وغیرہ۔ یہ اکثر گھرانوں میں شادی کے دن دلھنوں کو پہنائے جاتے ہیں۔ ان جوڑوں کی تیاری کے لئے خاص کر چوڑی والوں کو آڈر دیئے جاتے ہیں اب مسالے کے جوڑوں کے ساتھ ساتھ شیشہ، سیپی، موتی اور مختلف دھاتوں کی گوٹیں اور چوڑیاں بھی بنائی جا رہی ہیں۔

عیدوں تقاریب اور خصوصاً شادیوں میں قریبی رشتے دار خواتین، سہیلیوں اور ملازمین عورتوں کو کپڑوں کے ساتھ ساتھ چوڑی کے جوڑے بھی پہنائے جاتے ہیں۔

پہلے زمانے میں سہاگنوں اور بچیوں کے ہاتھ خالی رکھنا بدشگونی تصور کیا جاتا تھا کیونکہ بیوہ کے ہاتھ ننگے یا بغیر چوڑی کے رہتے ہیں۔ بعض بیوہ عورتیں چوڑیوں کے عوض سونے یا چاندی کے چوڑ پہنتی ہیں خاوند کے مرجانے کے بعد جب عورت کی چوڑیاں توڑی جاتی ہیں تو ایسے وقت انگیز مناظر ہوتے کہ میت میں جمع ہونے والے سبھی رو پڑتے۔ بیوہ کا رنگین لباس پہننا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

لڑکیاں پان اور مسی نہیں استعمال کر سکتی تھیں۔ مسی بیاہی عورت کا امتیازی نشان روز آنہ صبح ہونٹوں پر جمایا جاتا تھا۔ منجن، مسی، بیسن، ایک چاندی کی تھالی میں رکھکر کوئی خادمہ گھر کی بیگم صاحبہ کے سامنے لاکر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی آفتابہ اور سلفچی ان کے سامنے رکھتی۔ منہ دھونے پر تو لیہ پیش کیا جاتا۔ جب کنگھی کرنا ہوتا تو مغلانی آئینہ کنگھی اور تیل لاتی اور بیگم صاحبہ کے پیچھے ایک چوکی بچھا کر بیٹھ جاتی اور بیٹھ کر تیل گیری ڈالتی اور کنگھی چوٹی کرتی۔ کنواری

لڑکیوں کو کوڑلا۔ ڈالا جاتا تھا۔ بالوں کی لٹوں کو دو حصوں میں تقسیم کرکے اور کپڑے کو بیچ سے آدھا موڑ کر بالوں سے لپیٹتے تھے۔ یہ ان کے کنوارے پن کی علامت تھی۔ لڑکیوں کے بڑے ہونے تک ان کے سر پر ٹوپی پہنائی جاتی تھی جو کارچوب، مخمل یا اطلس کی مقوے (دفتی) پر چڑھی ہوئی ہوتی تھی عورتوں کو مہندی لگانے کا بڑا شوق تھا۔ عید، سالگرہ اور دوسری تقاریب میں مہندی لگائی جاتی لڑکیاں مہندی باغوں سے توڑ کر لاتیں۔ پیس کر اس کا لیپ چڑھاتی تھیں۔ دولھنوں کے ہاتھوں کو رت جگے سے مہندی لگائی جاتی تھی۔ اب مہندی اور پان کی سرخی پر تعلیم یافتہ طبقہ ہنسی اڑانے لگا ہے۔ اب کے زمانے میں مہندی اور پان کی جگہ کیوٹکس اور لپ رسٹک نے لے لی ہے۔ گالوں پر غازہ بھی لگاتے ہیں۔ آجکل میک اپ کا بہترین سامان حیدرآباد میں مل جاتا ہے۔

زیور

عورتوں کو اچھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہوتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ زیور پر بھی بری طرح ریجھتی ہیں۔ کیونکہ تقاریب وغیرہ میں زیور کے استعمال کو عزت کی علامت سمجھتے ہیں۔ رسم و رواج کے تحت بعض عورتیں پاؤں میں زیور نہیں پہنتیں اور بعض پاؤں میں چاندی کے زیور، کان، گلے اور ہاتھ میں سونا یا جڑاؤ زیور پہنتی ہیں۔ چھوٹے نگینوں کا زیور بالکل پسند نہیں کرتی ہیں شادی بیاہ کے موقع پر کان گلے ہاتھ اور پاؤں کا کم سے کم ایک ایک زیور دلھن کو ضرور دیا جاتا ہے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زیور کے بغیر لڑکی کی شادی کر دینا والدین کے لئے بڑی شرمناک بات ہے۔ بعض ایسے بھی افراد ہیں جو صاحب استطاعت ہونے باوجود زیورات کا استعمال پسند نہیں کرتے اور اپنی لڑکی کے جہیز میں زیور کی بجائے نقدی یا ایسی جائداد دیتے ہیں جس سے مستقل آمدنی کی صورت نکل آئے۔

ذیل میں زیورات کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔

سر کے زیور: ۱۔ جھومر: اسے بالوں سے متصل بھنووں کے کنارے لٹکاتے

ہیں۔ یہ مرزا بے پروا سے کسی قدر مشابہ مرصع زیور ہوتا ہے۔

۲۔ لاکڑی: یا راکڑی وہ طلائی زیور ہے جسکی شکل گول سرپوش سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ جس پر نسبت نقش و نگار کے علاوہ نگینے جڑ دیئے جاتے ہیں

۳۔ مرزہ بے پروا: یہ ایک ایسا زیور ہے جس کے تین چھوٹے چھوٹے جڑاؤ پھولوں کو تین طلائی لڑیوں میں لٹکایا جاتا ہے۔ پیشانی سے اوپر بائیں جانب سر کے بالوں میں جماتے ہیں۔ یہ دراصل عجمی زیور ہے جس کے پہننے کے بعد کسی اور زیور کے پہننے کی پروا نہیں رہتی۔

۴۔ چوٹی کا تعویذ: طلائی زنجیر میں چھوٹے چھوٹے تین تعویذوں کے آویزے چوٹی کے تعویذ کہلاتے ہیں۔ یہ زیور بڑا متبرک مانا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بزرگی اس نقش یا آیت کی بدولت ہے جو اس میں ملفوف ہوں۔

۵۔ چوٹی کے حتبے: چوٹی کے آخری حصے پر چار قبوں کا ایک جھومر لٹکایا جاتا ہے۔ ہر قبہ نصف گیند کی صورت میں سونے سے بنایا جاتا ہے۔

۶۔ چوٹی کی لاڑی: اس زیور کا رواج دراصل ہندوانہ ہے۔ جسے مسلم خواتین نے بھی بنا لیا۔ لاکڑی سے متصل چھوٹی چھوٹی طلائی راٹریوں کا سلسلہ چوٹی کے آخری حصہ تک چلا جاتا ہے

ماتھے کا زیور:

۱۔ ٹیکہ: اس زیور کو کہتے ہیں جو مانگ کے مقابل ماتھے پر لگایا جاتا ہے۔ یہ بیضوی شکل کی ایک ٹکیہ ہوتی ہے جس میں قیمتی نگینے جڑے ہوئے ہوتے ہیں صاحب اولاد ہونے کے بعد خواتین اس زیور کا استعمال ترک کر دیتی ہیں۔

کان کے زیور:

۱۔ انتی: انتی سے وہ زیور مراد ہے جو کان کے آخری حصے میں پہنا جاتا ہے۔ یہ ایک حلقۂ طلائی کا نام ہے جس میں دو موتی اور دونوں کے بیچ میں ایک رنگین نگینہ پروتے ہیں۔

۲۔ ادراج: یہ ایک جڑاؤ زیور ہے جو کان کے نچلے حصہ میں پہنا جاتا ہے سونے کے حلقہ میں یاقوت یا نیلم یا زمرد کا ایک بڑا سا منکہ موتیوں کی جھالر کے ساتھ لٹکایا جاتا ہے۔ یہ اپنی چمک دمک میں آفتاب کے مقابل سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ بھٹے: اس کی ساخت اگرچہ بکڑوں کی سی ہوتی ہے لیکن اس کے اطراف موتیوں کی لڑی اور جھالر ٹکا دی جاتی ہے۔

۴۔ بگڑے: اس زیور کی شکل کلس کی سی ہوتی ہے جس کے اطراف موتیوں کی جھالر اور اس کے سر پر ایک بڑا موتی لگایا جاتا ہے۔

۵۔ پنکھے: یہ ایک قیمتی جڑاؤ زیور ہے جو عاجی (ہاتھی دانت کے) پنکھے کی شکل میں یا بیضوی شکل کا ہوتا ہے جس میں ایک رنگی نگینے جڑے جاتے ہیں اور اطراف عمدہ عمدہ موتیوں کی جھالر۔ حیدرآباد میں اس کی بجائے چاند بالیوں کا زیادہ رواج ہے۔

۶۔ بالی اس چھوٹے سے طلائی حلقہ کو کہتے ہیں جو کان میں پہنا جاتا ہے۔ یہ کوئی زیادہ قیمتی زیور نہیں ہے جو امیر غریب لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔

۷۔ جھلملی۔ یہ کان کے ایک زیور کا نام ہے جو خام الماس سے بنایا جاتا ہے

اور اس کی چمک دمک مدھم سی ہوتی ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

۸۔ جھمکہ: موتیوں کی متعدد لڑیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ کان کی لو میں اسے پہنتے ہیں

۹۔ چاند بالیاں: ہلال کی شکل کا ایک جڑاؤ زیور ہے جس کے نیچے موتیوں کی جھالر نہایت خوشنما نظر آتی ہے۔

۱۰۔ چکریاں: چکری بھی کان کا زیور ہے جس میں قیمتی نگینے جڑے ہوتے ہیں اور اطراف میں موتیوں کا حلقہ ہوتا ہے۔

۱۱۔ چولا پھول: یہ زیور چکریوں سے کسی قدر مشابہ ہے۔ اگر فرق ہے تو اتنا کہ چولا پھول میں کنگرے ہوتے ہیں۔ اور چکریوں میں نہیں ہوتے۔

۱۲۔ کرن پھول: کرن پھول کی شکل چولا پھول سے مختلف ہوتی ہے۔ اس خوبصورت زیور نیچے کنگرے دار جھمکے بھی لگائے جاتے ہیں اس کے ساتھ ایک موتیوں کی لڑی ہوتی ہے۔ جس کے آخر میں ایک طلائی کانٹا لگا ہوتا ہے اس کے بالوں میں اٹکا دیتے ہیں۔

۱۳۔ لونگ کے پھول: یہ بہت ہلکا پھلکا طلائی زیور ہے جس کی شکل لونگ کے (تنکے) کے مشابہ ہوتی ہے۔

ناک کا زیور:

۱۔ بلاق۔ ایک طلائی حلقہ میں موتی کا آویزہ لگا ہوا زیور بلاق کہلاتا ہے۔ اس کا رواج ترکستان میں زیادہ ہے۔ یہ ناک میں پہنا جاتا ہے عموماً کتخدا لڑکیاں پہنتی ہیں اور شادی کے بعد اسکا استعمال ترک کر دیتی ہیں۔

۲۔ ناک کی دال۔ یہ زیور نہایت مختصر درحقیقت دال کے دانے کے برابر ہوتا ہے جس میں قیمتی نگینہ جڑا رہتا ہے۔ پشت پر ایک مختصر سا پیچ ہوتا ہے جس کو ناک کے سوراخ میں جما دیتے ہیں۔

۳۔ نتھ۔ اس حلقہ طلا کو نتھ کہتے ہیں جو بطور زیور کے استعمال کیا جاتا ہے اس میں دو موتی ان کے درمیان ایک زمردی یا یاقوتی یہ سرخ منکہ ہونا ضروری ہے۔ یہ زیور جو سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا ہے دولھا کی طرف سے دلہن کو عطا کیا جاتا ہے عورتیں اس زیور کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ ہندوؤں میں اس کا رواج ہے۔

گلے کے زیور:

۱۔ تلسی: اسے تلسی دانہ بھی کہتے ہیں جو ایک متبرک زیور مانا جاتا ہے پانچ سے گیارہ تک اس لڑیاں بنائی جاتی ہے ایک لڑی سے دوسری لڑی کسی قدر لمبی ہوتی ہے جیسے زیور عریض نظر آتا ہے۔

۲۔ جگنی: یہ ایک زیور ہے جو گلے میں پہنا جاتا ہے بادامی شکل کا ہوتا ہے، ٹیکہ کے مشابہ ہوتا ہے جس میں چمکیلے نگینہ جڑے ہوتے ہیں ہر نگینہ جگنو کی طرح چمکتا ہے۔

۳۔ چمپا کلی: یہ اس مرصع زیور کا نام ہے جس کے دانے چمپا کی کلیوں سے مشابہ ہوتے ہیں بعض کلیاں طلائی ہوتی ہیں اور بعض مرصع (جڑاؤ) ہر کلی کے سرے پر ایک موتی لگایا جاتا ہے اور تمام کلیاں ایک ہار کی شکل میں پروی جاتی ہیں۔

۴۔ چنتاک: تلنگی زبان میں ایک خاص زیور کا نام ہے جو گلے میں پہنا جاتا ہے چھوٹے چھوٹے خوبصورت مرصع تعویذوں کو ڈوریوں میں پرو کر بنایا جاتا ہے۔

۵۔ چندن ہار: جو دراصل میں چندر ہار تھا یہ سونے کی ٹکیوں سے بنایا جاتا ہے۔ ہر ٹکیہ گول ہوتی ہے جس کو چاند سے تشبیہ دی گئی ہے اس کی کئی لڑیاں ہوتی ہیں۔ طول میں ایک ہار دوسرے سے جڑا ہوتا ہے۔

۶۔ ستلڑا: موتیوں کے سات لڑی رکھنے والے زیور کو ستلڑا کہتے ہیں ہر لڑی کو دوسری لڑی سے کسی قدر لمبی ہوتی ہے، اور آخر میں دونوں جانب انکے سروں کو ایک ڈوری میں گھٹوا کر اسی طرح گلے میں باندھتے جیسے تلسی یا چندن ہار کو

۷۔ گلسر: گلسر کا زیور طلائی دانوں اور پوت کی شرکت سے لڑیوں میں پرویا جاتا ہے جس میں کئی منکے شریک کئے جاتے ہیں اسے غریب عورتیں بہت پہنتی ہیں

۸۔ لچھا: یہ ایک خوبصورت زیور ہے جو گلے میں باندھا جاتا ہے، ہندو مسلمان سب ہی خواتین استعمال کرتی ہیں لچھے کے سینکڑوں نمونے بن چکے ہیں اور بنتے جاتے ہیں جیسا کہ اس کے ان ناموں سے ظاہر ہے۔ چوکڑوں کا لچھا تعویذوں کا لچھا، سموسوں کا لچھا۔ سادا کا لچھا، آدنزوں کا لچھا۔ جھالردار لچھا، چوگوشی لچھا، جڑاوی لچھا وغیرہ اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کیونکہ یہ سہاگ کا زیور سمجھا جاتا ہے۔

مالا۔ صرف موتیوں یا زمردی یا فیروزی یا عقیقی منکوں سے پرویا جاتا ہے جس کو مرد اور عورت دونوں گلے کی زینت بناتے ہیں۔

ہنسلی: گلے میں پہننے کا ایک زیور ہے جسے فارسی میں طوق زرین کہتے ہیں۔ سیفی سونے یا چاندی سے بنائی جاتی ہے جس میں نقش و نگار کے سوائے نازک گھنگرو جھالر کے طور پر لٹکائے جاتے ہیں۔

ہار: یہ ایک قیمتی زیور کا نام ہے جو طلائی پھولوں یا تعویذوں سے پرویا جاتا ہے۔ جس میں الماس جڑے جاتے ہیں اور ہر پھول یا تعویذ کے آخری میں ایک موتی لٹکایا جاتا ہے۔

بازوں کے زیور:

۱۔ بازوبند: بازوبند اس زیور کو کہتے ہیں جو کہنی اور مونڈھے کے درمیاں باندھا جاتا ہے۔ یہ زیور طلائی یا جڑاؤ تعویذوں یا پھولوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کی تشکل مستطیل ہوتی ہے جسے ڈوریوں کے ذریعہ سے سیدھے بازو پر باندھتے ہیں

۲۔ بازو کے کڑے: کڑا اس طلائی یا نقری حلقے کا نام ہے جو بازو یا کلائی میں پہننے کے لئے بنایا جاتا ہے بازو کے کڑے سے وہ مخصوص دو حلقے مراد ہیں۔ جو ابھرے ہوئے نقش و نگار کے ساتھ صرف ایک بازو کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ دکن میں بازو کے کڑوں کا عام رواج ہے۔

۳۔ کنگنی بیڑی: یہ زیور بازو کے کڑوں کا جواب ہے۔ یعنی ایک بازو کے کڑے پہنتے ہیں اور دوسرے بازو پر کنگنی پڑی ایک بیڑی کے دونوں جانب دو کنگیاں جڑھانے کا رواج ہے۔ یہ زیور بھی مثل کڑوں کے اہل دکن کا زیور سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ نورتن: نورتن سے بازو کا وہ زیور مراد ہے جس میں نو قسم کے جواہرات جڑے جاتے ہیں۔ مثلاً یاقوت، موتی، پکھراج، زمرد، مونگا لاجبرد، نیلم، الماس، زوزہ،

کلائی کے زیور:

پہنچی: یہ ایک طلائی یا جڑاو زیور کا نام ہے جو پہنچے میں پہنا جاتا ہے یہ زیور انار کے دانوں کی شکل میں بنایا جاتا ہے جس کے ہر دانے میں ایک ایک قیمتی نگینہ جڑا جاتا ہے۔ ہر دانے کے نیچے ایک باریک سا حلقہ ہوتا ہے جس میں ریشم پروکر ایک دانے کو دوسرے دانے کے ساتھ جاتے ہیں۔

سمرن:

سمرن اس زیور کا نام ہے جو بلور یا کانچ یا مونگے یا موتیوں کے چند دانو کو پروکر بناتے ہیں۔ راجپوت عورتیں بھی اس کا استعمال کرتی ہیں۔

کنگن:

اس زیور کی ساخت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک سادہ جو صرف چاندی یا سونے سے بنایا جاتا ہے۔

دوسری مرصع یا جڑاؤ جس میں رنگ برنگ کے نگینے جڑے جاتے ہیں۔ یہ ایک سخت حلقہ اور ایک جسم ہوتا ہے جس کا استعمال چوڑیوں کے آخر میں ہوتا ہے۔

گوٹ: اس طلائی زیور کو گوٹ سے موسم کیا گیا ہے جو کلائی کے لئے چوڑیوں کی شکل میں بنایا جاتا ہے۔ ہر کلائی میں کم سے کم دو گوئیں چوڑیوں دونوں طرف پہنی جاتی ہیں۔

پنجہ کے زیور:

۱. آرسی۔ ایک قسم کی انگوٹھی کا نام ہے جس پر نگینہ کی بجائے ایک چھوٹا سا گول آئینہ جڑا ہوتا ہے۔

۲۔ انگوٹھی: اس مرصع طلائی یا نقروی زیور کا نام ہے جو ہاتھ کی انگلیوں پہنا جاتا ہے۔ اسے فارسی میں انگشتری کہتے ہیں اس کی شکل ایک حلقہ کی سی ہوتی ہے جس پر ایک یا کئی نگینے جڑے جاتے ہیں۔

۳۔ چھلہ: چھلوں کا استعمال انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کے سوا باقی تینوں انگلیوں میں ہوتا ہے۔ بعض چھلے انگلیوں کے جوڑوں میں بھی پہنے جاتے ہیں جن کا نام پھیری رکھا گیا ہے۔

کمر کے زیور:

کمر بند: طلائی یا نقروی تار سے تیار ہوتا ہے جس کو عورتیں اپنے لباس اوپر کمر میں باندھتی ہیں۔ اس کا نام زر کمر ہے۔ ہندو عورتیں اس کو ساڑی کے اوپر باندھتی ہیں۔

پاؤں کے زیور:

۱۔ بیڑی: پاؤں کے زیورات میں طلائی یا نقروی بیڑی اس زنجیر کا نام ہے جو خاص وضع پر بنا کر منت کے طریقے پر پاؤں میں پہنائی جاتی ہے کیونکہ شہادت حسینؑ کے بعد امام حسینؑ کے صاحبزادے امام زین العابدین کے پاؤں میں بیڑی اور گلے میں طوق پہنا کر اسیر کر لیا گیا تھا اسی کی یادگار کے طور پر چہار اہل بیت اپنے اہل و عیال کو محرم میں یہ بیڑی پہناتے ہیں۔

۲۔ پازیب: ایک خوبصورت ہے، جسے متعدد سادہ کڑیوں سے بنا کر اس کے نیچے گھنگرو لٹکاتے ہیں۔ یہ عام طور پر سونے چاندی کے ہوتے ہیں۔ مگر بڑے گھرانوں میں جڑاو بھی پہنتے ہیں۔

۳۔ پائل: یہ پازیب سے مشابہ ایک زیور ہے جو کڑیوں سے بنایا جاتا ہے اس کی ساخت تعویذ نما ہوتی ہے اس کے اطراف گھنگرو کی جھالر ویسی ہی ہوتی ہے جیسے پازیب میں۔

۴۔ توڑا: طلائی یا نقروی تاروں کو پیچ دیا ہوا ایک خاص شکل کا زیور ہے یہ دو طریقہ کا ہوتا ہے ایک زلفی جس میں طلائی یا نقروی تاروں کو زلف کی شکل میں پیچ دیکر بناتے ہیں۔ دوسرا ہسن۔ یہ طلائی یا نقروی ہنی کی ایک مسلاک ہوتی ہے۔ اہل حیدر آباد کو نسی توڑے پسند ہیں۔

۵۔ گجرا: ایک طلائی یا نقرئی زیور کا نام ہے جو مثل توڑوں کے پاؤں میں پہنا جاتا ہے اس کی ساخت طلائی یا نقرئی تار سے پاس پاس گھٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے گوپ مجازاً اس کو گجرا کہا گیا جو گلے میں پہنا جاتا ہے۔

۶۔ لول: یہ خاص زیور ہے جو باریک طلائی منکوں سے بنایا جاتا ہے۔ یہ زیور بہت ہلکا اور کم وزن ہوتا ہے۔ سونے کا ورق مثل کاغذ کے گھر کر اس سے لول بناتے ہیں۔ اس کے اندر لاک بھر دی جاتی ہے۔

۷۔ منکے: یہ پاؤں کا زیور ہے جسے ہندی میں بڑ کہتے ہیں بڑ ایک کیلے پھل کا نام ہے طلائی منکے بڑ کی شکل میں بنائے جاتے ہیں اور ان کو ایک ڈور میں پرو کر اس کا حلقہ پاؤں میں پہنا جاتا ہے۔

پاؤں کے انگلیوں کے زیور: گھول: پاؤں کی انگلیوں اور خاص کر انگوٹھوں میں جو چھلے پہنے جاتے تھے انھیں گول کہتے ہیں۔ عموماً چاندی سے بنائے جاتے ہیں۔

پان پھول اور عطر کا رواج

شاہان مغلیہ سے سلطنت آصفیہ کو جو چیزاں ورثہ میں ملیں ان میں سے ایک پان کا استعمال بھی تھا۔ دکن میں سلیقہ سے پان کا رواج بھی پڑ گیا۔ طبعی ضروریات کے قطع نظر جمالیاتی اغراض کے لئے بھی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

پاندان جہیز کا ایک جز ہے۔ یہ شادی میں ضرور دیا جاتا ہے اور روزآنہ پان کھایا جاتا ہے لوگوں کو پان کی طلب ہوتی ہے۔ غریب عورتیں پان کی تھیلی کپڑے کی استعمال کرتی تھیں۔ چھوٹے پاندان سفر کے وقت ساتھ لے جاتے۔ اس کو سفری پاندان کہتے ہیں۔

پان کلی دار، ونرم پہاڑ کے پان بھی مشہور ہیں۔ پان کا انتخاب کیا جاتا ہے کھتہ، چونا، سروطے کی کٹی ہوئی سپیاری، الائچی، چکنی، لونگ، نرملی، جوز، جوتری، پاندان میں قرینے سے جما دیئے جاتے ہیں۔ ہر پاندان میں ایک چاندی کا آئینہ اور پان کی ڈبی، جھیلہ چاندی کا اور چھوٹی پان کی کشتی بھی ہوتی۔ پان کے بیڑے مہمانوں کو بھی بڑے اہتمام سے پیش کئے جاتے تھے۔ بعض لوگ پان کے ساتھ زردہ کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

امراؤں کے یہاں چکنی سپیاری دودھ میں بھگو کر بڑے سلیقہ سے کٹوائی جاتی تھی پان کے ساتھ نرملی بھی حیدرآباد میں بہت استعمال کی جاتی ہے نرملی ایک درخت

یتیم ہے صرف دکن کے پہاڑی علاقوں میں نرملی کے درخت پائے جاتے ہیں۔

پاندان کی ساخت بھی غیر معمولی صناعی اور جدت طرازیوں سے بنی۔ پاندان بنانے والے کاریگر اکثر کریم نگر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کریم نگر میں چاندی کے جال کا کام بہت عمدہ بنتا ہے۔ پاندان، خاص دان، اگال دان اور پان کی تھالی ہر گھر میں ہوتی ہے۔

حُقّے کا رواج: قدیم زمانے میں سگار اور سگریٹ نہیں تھے۔ اگر تھے بھی تو ہی کم حیدرآباد میں چار مینار اور گولکنڈہ سگریٹ فیاکٹری بہت مشہور تھے، ان کارخانوں کے بنے ہوئے سگریٹ لوگ پینے لگے۔ غریب لوگ بیڑی پیتے تھے ایک پیسے میں ۱۰ یا ۱۲ عدد بیڑیاں ملتی تھیں۔ اکثر نوکر چاکر کچے پتے میں تمباکو کو لپیٹ کر سگار کی طرح پیتے تھے۔ ہاپتے کی دمی بنا کر اس میں تمباکو کو بھرتے اور اس پر آگ بھی ڈلی رکھ کر دھنواں کھینچتے تھے۔ اکثر گھروں حقے کا رواج تھا۔

حیدرآباد کی مامائیں

سلطنت مغلیہ میں محلات کے انتظام کی ذمہ دار مامائیں ہوتی تھیں۔ شاہان آصفیہ جب دہلی سے حیدرآباد آئے تو اپنے ساتھ مامائیں بھی لے آئے۔ جن کے وہ زیر پرورش رہے تھے۔ آصف جاہ دکن میں ماماؤں کو لاکر اُن کو اختیار دیئے ان ماماؤں نے کافی اعتماد حاصل کرلیا تھا اور بڑے بڑے مسائل انھیں ماماؤں کے ذریعہ حل کئے جاتے تھے حیدرآباد میں عورتوں کی بڑی قدر اور منزلت تھیں امراء اور خوش معاش گھرانے کی عورتیں پردہ کرتی مگر عوام میں پردہ نہ تھا۔ اوسط گھرانے کی عورتیں بھی پردے کی بڑی پابند تھیں گھر کے اچھے اور برے کاموں کی خبر گیری بڑی بوڑھی عورتیں کرتی تھیں۔ امور خانہ داری کے علاوہ امیر گھرانوں میں مامائیں کافی اہم کام بھی کرلیتی تھیں۔ مامائیں ریاست کے کاموں میں بھی مداخلت کرتی تھیں۔ مامائیں جن کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ وہ مامائیں نہیں جو کھانا پکایا کرتی ہیں بلکہ یہ وہ مامائیں تھیں جو قابل، تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہوتی تھیں۔ عورتوں میں وکالت بھی کیا کرتی تھیں۔

حیدرآباد میں عورتوں کو معاشرے کے اکثر معاملات میں کافی آزادی حاصل تھی۔ مرد گھر کی عورت ملکہ کا رتبہ دیتے تھے۔ حیدرآباد کی ماماؤں میں

چند مامائیں بہت مشہور ہوئیں۔

ماما بڈن : حیدرآبادی ماما تھی۔ آداب شاہی اور انتظامی امور سے واقف تھی۔ یہ سقہ کی بیٹی تھی بارہ روپیے تنخواہ ماہوار پاتی تھیں بڈن پیٹ کی زمین اور چالیس روپیئے ماہوار پالکی دی گئی تو ماما بڈن جہاندار جاہ کی والدہ زینت النسا بیگم کے پاس اڑتالیس برس تک کام کرتی رہی۔ اس کے بعد چمبلی کنیز کو ماما مقرر کیا گیا تھا۔ ماما چمپا ماما منا کی پروردہ تھی اس کی ہوشیاری کی وجہہ سے حضور اس سے کام لیتے تھے چمپا پیٹ کی زمین اس کو دی گئی تھی یہ بارہ روپیئے ماہوار سے چالیس روپیئے تک پہنچ کر پالکی سے سرفراز ہوئی۔ ماما چمپا کا نکاح فوج کے دلاور خان سے ہوا تھا۔ فوج دلاور خاں کا باپ سید محمد نامی تھا اور ماما چمپا ڈیرھ سو گاڑیوں کی جمیعت سے سرفراز کی گئی تھی ڈیڑھ سو گاڑیں ماما منا کے تحت تھیں جو اس کے انتقال کے بعد ماما بختاور کو دے دی گئی۔

ماما شریفہ بھی حیدرآباد کی مشہور ماما تھی۔ حیدرآباد میں ایک دفتر جو طوائفوں کلاکاروں، ناچنے گانے والوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دفتر کی مہتمیہ بھی ایک ماما ہوتی تھی۔ ایک مدت تک ماما شریفہ کچہری ارباب نشاط کی مہتمیہ رہی یہ حضور کے اعتماد کی خاتون تھی۔ اس کے تحت ایک جمعدار، چار اہل کار اور بہت سارے جوان، ہرکارے مقرر تھے۔ ماما جمیلہ بھی حیدرآباد کی مشہور تاریخی ماما تھی اس نے بہت عروج حاصل کیا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے لڑکوں کو محلات میں پہچا دیا کرتی تھی۔ چنانچہ بعض خطاب یافتہ لوگ بھی

اس کے گھر لنے میں گزرے ہیں۔ وہ جاگیر سے بھی سرفراز تھی۔ ماما جمیلہ کی دیوڑھی مٹی کے شیر کے راستہ پر ہے اور یہ دیوڑھی ترجنگ اس کے نام سے مشہور ہے۔ محبوب علی بادشاہ کی مسند نشینی چونکہ صغر سنی میں ہوئی تھی اس لئے دربار میں وہ ماما جمیلہ کی گود میں تشریف فرماتے۔

ان قدیم ماماؤں کا لباس بھی مخصوص تھا وہ سفید ململ کی کرتی اور چولی ہمرو، مشرو یا سوسی کا پاجامہ پہنتی تھیں۔ ململ کا چھ گز کا ڈوپٹہ جسے رنگ کر چنا جاتا تھا اوڑھتی تھیں۔ ڈنڈ کے کڑے گنگیاں اور جوتی کے موتی ہوتے۔ قدیم طرز کا جوتا پہنتی تھی جو آج بھی حیدرآباد میں دلھنوں کو پہنایا جاتا ہے۔ بعد میں ڈوپٹہ کی بجائے ہنکنڈے کے رومال کو استعمال کرتی تھیں۔

آگے چل کر ان ماماؤں کے لباس اور جود باس کے طریقے بالکل بدل گئے اب ماماؤں کی تنخواہوں کے ساتھ ساتھ ان کے کام کرنے کے طریقے بھی بدل چکے ہیں۔ آجکل مامائیں دن دیکھکر کام کرکے اپنے گھر لوٹ جاتی ہیں۔

حیدرآباد کے کھانے اور دسترخوان

حیدرآباد میں کھانے کے مختلف اوقات ہیں صبح کا ناشتہ جو چھ بجے صبح کے دس بجے تک ہوا کرتا تھا۔ چائے کا استعمال اگلے زمانے میں حیدرآباد میں نہیں تھا۔ لیکن بعد کو اس کا رواج ہوگیا۔ دوپہر کا کھانا گیارہ بجے سے دو تین بجے تک ہوا کرتا۔ رات کا کھانا شام کے چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ہوا کرتا تھا۔

حیدرآباد میں چاول کا استعمال زیادہ ہے اس کے ساتھ گیہوں کی روٹی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں کی آب وہوا کے لحاظ سے گھٹاؤ کا استعمال ضروری ہے، نمک مرچ اور ترشائی بھی اچھی مقدار میں سالنوں کے پکانے میں ڈالی جاتی ہے کھٹے سالن مٹی کی ہانڈی میں پکائے جاتے تھے۔ پانی کی مراحیاں، اور گھڑے اور دوسرے برتن مٹی کے کثرت سے استعمال میں لائے جاتے تھے۔

تانبے کے برتن دیگچیاں، تھالے، لگن، گنگال وغیرہ تو قلعی کرائی جاتے اور پکوان اور کھانے کے برتن بھی چینی کے ساتھ ساتھ تانبے ہی کے ہوتے تھے۔

باورچی خانہ جو رہنے سہنے کے کمروں اور دالان سے کافی دور آنگن میں بنایا جاتا تھا۔ ہر گھر مٹی کے چولھے ہوتے اور گھر سے دھواں نہ اٹھے تو بدشگون سمجھتے تھے۔ پکوان لکڑی اور کوئلوں پر ہوتا تھا۔

صبح ہوتے ہی ہر کام سے پہلے گھر کو جھاڑو دی جاتی تھی۔ ہندو خواتین گھر کے اندر کے ساتھ ساتھ دہلیز پر بر بٹو لگاتے اور گھر کے سامنے میں چھڑکاؤ کرتے اور مگوھٹے خاص ڈیزائن بناتی تھیں۔ نہا دھو کر خواتین عبادت کرتی اور پکوان کے لئے باورچی خانہ میں پہنچ جاتیں۔

حیدرآباد میں جو غذائیں استعمال کی جاتی ہیں وہ بہت لذیز اور مرغوب ہوتی ہیں۔ گھروں میں پکانے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگ بازاروں سے تیار کی ہوئی غذائیں استعمال کر لیتے ہیں طوائی کی دوکانوں سے مٹھائیاں خرید کر کھاتے ہیں اس کے علاوہ راستوں پر بیوپاری سو دال چڑوا مرچی جیسے پکوڑی لقمی اور مختلف تلن کی چیزیں مل جاتی ہیں۔

قطب شاہی دور سے آصفجاہی دور تک دستر خوان میں وسعت پیدا ہو گئی تھی خصوصاً گوشت کے پکوان میں ایرانی، ترکی، افغانی پکانوں کا کافی اضافہ ہوا۔ ملکوں کے امتزاج کے ساتھ ساتھ غذاؤں کا ایک معیار آصفجاہی دور سے ہی قائم ہو چکا تھا۔

حیدرآباد کے خاص خاص کھانے

حیدرآباد میں دستر خوان سرخ رنگ کے ہوتے اور فرش پر بچھائے جاتے۔

ا۔ ناشتہ میں اکثر کھچڑی، قیمہ، پاپڑ، انڈے، تلا ہوا گوشت اور پراٹھے، روغنی روٹی، ڈبل روٹی ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ نہاری کھڑی دال یا میٹھی دال ناشتہ میں پکائی جاتی تھیں۔

گرم گرم کھچڑی ناشتے میں گھی قیمہ اور اچار کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اس کے پاپڑ تو

سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہیں۔

۲۔ قدیم زمانے میں یہاں کا عام ناشتہ بازاری نہاری رہا ہے جو امیر اور غریب سب کی مرغوب غذا ہے۔ اکثر گھروں میں راتب مقرر تھا چار سے کی نہاری دو پیسے کے کلیجے ایک شخص ایک آنہ میں ناشتہ کرلیتا تھا۔ دکن میں نہاری سراپائے اور زبان کی ہوتی ہے۔

۳۔ چاکنہ حیدرآباد کی خاص غذا ہے۔ اپنا ایک مخصوص ذائقہ رکھتا ہے اس میں بکرے کا سر، کلیجی، دل اوجھڑی اور سردان ڈالکر پکاتے ہیں۔ مرچی کی زیادتی اور لونگ کے پھول کے استعمال سے اسکا ذائقہ اور بڑھ جاتا ہے اور زبان کا چٹخارہ بھی جوار کی روٹی کے ساتھ کھانے میں بڑا مزہ دیتا ہے۔

۴۔ پورن پوری: حیدرآباد کے سوا اور کہیں نہیں بنتی۔ پرانے زمانے میں شاہی رکاب دار کی پورن پوری بہت مشہور تھی۔ سرخی مائل تقریباً دیڑھ انچ موٹی مانڈے سلے سلے دس گیارہ پتہ اس قدر ملائم ہوتی ہے کہ بلا ٹوٹے آسانی سے نکل آتی ہے۔ پورن کا پکانا میدے کا گوندھنا ماندے کا بیلنا اس کو سیکھنا بہت تناسب ہوتا ہے۔

حلوائی کے مل س کا شاہی قلا قند اور بالائی یہاں بہت شوق سے کھائی جاتی ہے جوزی حلوہ تو بہت ذائقہ دار ہوتا ہے۔

۵۔ بگھارے بیگن۔ حیدرآباد میں کھٹے کا بہت استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مرچی بھی زیادہ کھائی جاتی ہے۔ یہ سالن اکثر بریانی کے ساتھ دعوتوں میں دسترخوان کی زینت بنتا ہے۔ اودے اودے بیگن چن لئے جاتے ہیں مسالہ

مسالہ اور املی (یکی) کا کھٹا نمک اور مرچ ہلدی اور میٹھے تیل کی مناسبت سے اس سالن کی لذت بڑھ جاتی ہے مٹی کی ہنڈی میں پکایا جائے تو سالن میں سوندھا پن آجاتا ہے۔ بیگن کو سارے خود کاٹ کر نمک کے پانی میں ڈال دیتے ہیں ورنہ بیگن کسا لے ہو جاتے ہیں مسالوں میں تل، زیرہ۔ جوار کھوپرا، مونگ پھلی، تل اور پیاز کی ڈلیوں کو گرم راکھ میں رکھ کر بھونا جاتا ہے۔ جب وہ گرم ہو جاتی ہے تو راکھ سے نکال کر پیاز کو بھی باریک پیس لیتے ہیں۔ زیرہ اور لہسن کے بگھار تیار کر لیتے ہیں۔ پھر بیگن کے بیچ میں ایک لکیر نمک کا کنکر رکھ کر مرچ مسالوں کو بھرا جاتا ہے۔ ہانڈی میں ڈالکر خوب بھنتے ہیں۔ بعد کو املی کا کھٹا ڈالتے ہیں۔ کریا پات ہری مرچ اور کوتھمر وغیرہ ڈالتے ہیں اچھی طرح دم دیتے ہیں انگارہ پر دم ہوئے سالن میں تیل اوپر تو بہت آجاتا ہے تب ہی سالن میں ذائقہ آجاتا ہے۔

۶۔ شیر خورمہ: یوں تو حیدر آباد میں ہمہ اقسام کے میٹھے پکتے ہیں لیکن حیدر آباد کا شیر خورمہ خاص ذائقہ رکھتا ہے یہاں پر اس میٹھے کے پکانے کا طریقہ بھی اور ہے۔

شیر خورمہ کا جز سیویاں ہوتی ہیں۔ یہ اصل دودھ سے بنایا جاتا باریک سیویوں کو جسے یہاں پٹے کی سیوی کہتے ہیں۔ گھی میں سرخ مائل رنگ تک تل کر اس میں دودھ ڈالا جاتا ہے ضرورت شکر ڈالدی جاتی ہے کھجوریں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ بادام، کاجو، پستے کی سلائیوں اور چرنجی صاف کرکے تل لیتے ہیں اور شیر خورمہ میں ڈالا جاتا ہے۔ شیر خورمہ تو

عیدالفطر کی خاص ڈش ہے۔ اس کے رکھنے اور کھانے پینے کے لئے خاص بلوری کٹورے ہوتے ہیں نہاری ہوئی سیویوں پر گھی شکر، رنگین چوبا اور مغزیات ڈال کر سجایا جاتا ہے۔ یہ شیر خرمہ اور سیویاں عیدالفطر کے روز بطور حصہ ایک دوسرے کے گھر بھیجتے ہیں اور اس سے مہمانوں کی ضیافت کی جاتی ہے۔

بریانی: حیدرآباد میں چاول کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ کھانے میں سادے چاول، بگھارا کھانا، کھچڑی قبولی، نہاری، ترکاری کے کھانے کے روز آنہ کچھ نہ کچھ ملتے ہیں۔ لیکن حیدرآباد کی بریانی بہت مشہور رہی ہے۔ اپنا ایک خاص ذائقہ رکھتی ہے۔ اور سب ہی حیدرآبادی جو گوشت کھاتے ہیں۔ بریانی بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں اور اس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ بریانی تقریباً ہر بڑی دعوت کا لوازمہ ہوتی ہے۔ بریانی جو اکثر دعوتوں میں ہوتی ہے وہ دو گوشتہ ہوتی ہے یا کچی کی ہوتی ہے۔ بریانی مرغ اور مچھلی اور کوفتوں کی بھی بنائی جاتی ہے۔ دس کے انڈوں اور ٹماٹوں کو بھی ڈالا جاتا ہے۔ بریانی کا چاول عام چاول سے الگ ہوتا ہے اس میں خوشبو ہوتی ہے جیسے کہ امرتسر کے چاول کالا بھات، کھچڑی چاول وغیرہ۔

بریانی کے لوزمہ میں نقمی، کباب، مرغ، سادہ آلو کا قورمہ، سبز مال، کباب، نقمی، دہی کی چٹنی وغیرہ بگھارے بیگن یا مرچ مسالے دار سالن ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک دو میٹھے۔ زمانہ قدیم ہی سے شیر مرغ یا کدو کی کھیر، گل فردوس ڈبل کا میٹھا، نہ پلر قربانی کا میٹھا ان میں سے ایک کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ دعوتوں کا پکوان باورچی کرتے ہیں شاہی باورچی ایسے پکوان

بہت عمدہ طریقہ پر پکاتے ہیں۔

۸۔ دالچہ: حیدرآباد کا یہ سالن بھی خاص ہے۔ دالچہ اکثر کدو کا ہوتا ہے کبھی کبھی بیگن یا ٹماٹر کا بھی دالچہ یہاں پکتا ہے۔ دالچہ اکثر بگھارے کھانے کے ساتھ نیازوں اور چھوٹی موٹی تقاریب اور اکثر غربا کے شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی بگارا کھانا، دالچہ، آلو میتھی گوشت یا قورمہ پکواتے ہیں اور اس کے ساتھ جو میٹھے چاول پکائے جاتے ہیں۔ دکن میں اس کو میٹھا کھانا کہتے اکثر غریب لوگ اچھی بُری تقریبوں میں ضرور پکواتے ہیں۔ دالچہ میں گوشت ہڈی دار، نمک مرچ، املی، چنے کی دال، گرم مسالہ ہرا مسالہ ڈالکر پکاتے ہیں دارچینی اور گرم مسالا صرف یہاں دالچے میں ڈالا جاتا ہے۔ ورنہ اکثر کھٹے سالنو میں خوشبودار مسالہ میں ڈالے جاتے صرف مسالوں کے سالنوں میں ڈالے جاتے

۹۔ تل کی چٹنی: یہ حیدرآباد کی خاص چٹنی ہے جو ناشتہ میں کھچڑی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ تل کو بھونتے اور صاف دھو لیتے ہیں۔ ہری مرچ کو تھر پلو دینے اور املی کے ساتھ پیس لیا جاتا ہے چٹنی پیسنے کے بعد پیاز کتر کر ملاتے دیتے ہیں بڑی ذائقہ دار ہوتی ہے اس کے کھانے سے صفرا کم ہوتا ہے۔

۱۰۔ مچھلی کا سالن: دکن میں مچھلی کثرت سے ہوتی ہے کیونکہ یہاں بیشمار ندیاں، تالاب، کنٹے وغیرہ ہیں۔ مچھلی بہ آسانی دستیاب ہوتی ہے۔ فش مارکٹ سکندرآباد اور بیگم بازار کی مشہور ہے۔ اور یہاں بہت لوگ خریدنے آتے ہیں حیدرآباد میں جہاں گڑبڑ زیادہ ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا "یہ مچھلی مارکٹ ہے" مچھلی تلی ہوئی، مٹنک جنڈ ربھی ملتی ہے۔

اور نمائشوں اور میلوں میں بھی تلی ہوئی مچھلی بکتی ہے۔ لوگ بڑے شوق سے خرید کر کھاتے ہیں مچھلی کھٹے میں مسالوں کے ساتھ پکی ہو تو کچھ دن رہ بھی سکتی ہے اکثر یہ سالن بھی ہانڈی ہی میں پکایا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں ماہر پکوان مچھلی کے کانٹوں کو الگ کر کے پکاتے ہیں۔ تاکہ پکاتے وقت کانٹوں کے چبھنے سے خصوصاً بچے محفوظ رہے۔ یہاں روہو، وٹہل مچھلی، کرتا، معروف پالیٹ مچھلی بھی بہت ملتی ہے۔ لیکن لوگ مرل مچھلی جس کا ذائقہ بہت اچھا ہوتا ہے استعمال کرتے ہیں۔ دریائی جھنگوں کا سالن بھی خاص خاص لوگوں کے پاس پکتا ہے۔ مچھلی موسم سرما میں اور بارش میں کثرت سے کھائی جاتی ہے۔ بہت گرم اور صحت بخش ہونے کی وجہہ سے مچھلی یہاں کی مرغوب غذا ہے۔

بمبل مچھلی: دکھنیوں کی خاص غذا ہے۔ دکن کے لوگ کبھی انگاروں پر بھون کر ویسے ہی کھالیتے ہیں یا ان کے سالن میں بمبل مچھلی یا (سوکھے) جھینگے ڈال کر جواری کی روٹی کے ساتھ کھایا کرتے ہیں جو سستی اور دیرپا رہنے کی وجہہ سے گھروں میں جمع رکھی جاتی ہے۔

کبھی کبھار پالک اور بیگن پکاتے ہیں مزہ دار سالن ہوتا ہے تل کر بھی کھاتے ہیں۔

دہی کی کڑی: دہی کی کڑی پر بھی حیدرآبادی بڑے شوق سے پکاتے اور کھاتے ہیں۔ دہی کو ہلدی مرچی نمک اور زیرے کی باریک پسی ہوئی پکنی ملا کر باریک ململ کے کپڑے سے چھان لیتے ہیں اور اس میں ہرا مسالا، کیریا پات

ڈالکر ابال لیتے ہیں۔ بھجیے چنے کی دال کے بیسن کے تلکر اس میں ملاتے ہیں یہ بھجیے بیسن میں ہری مرچ سی ہوں۔ تھوڑی سی سرخ مرچ، ہلدی، زیرہ پیسا ہوا۔ اور پیاز کو باریک کتر کر سکھا لیتے ہیں پھر کڑھائی پر تل لئے جاتے ہیں۔ بھگار جس میں سوکھی مرچ، لہسن کی چھلی ہوئی پوتھیاں، زیرہ، کریاپات کو میٹھے تیل میں تلکر جب سُرخ ہوجائے بھگارتے ہیں۔

اکثر یہ سالن سیروتفریح کو جاتے وقت یا سفر کرتے وقت ساتھ لے جاتے ہیں ویسے بھی جس گھر میں دہی کی کڑی پکی تو محلے والوں کو یا جس ایک ایک کٹورا دہی کی کڑی بطور تحفہ ضرور بھیجی جاتی ہے۔

۱۳- چاول کی کڑی: حیدرآباد کی خاص چیز ہے یہ تو صرف حیدرآباد ہی میں پکائی جاتی ہے۔ کسی دوسری جگہ نہیں پکائی جاتی۔ یہ مزے میں سوندھی اور لذیز ہوتی ہے۔ خشکے کے ساتھ یا سمدون کے سالن کے ساتھ جس میں گوشت کی کمی بنائی جاتی ہے مسالے جیسے دہی اور مسالوں کو ڈالکر بناتے ہیں کھائیں تو کھانے لطف اور بڑھ جاتا ہے۔

چاول کی کنکیاں بھگاکر زیرا۔ بو جوار اور لہسن کے ساتھ پیس لیتے ہیں اور املی کا کھٹا نکال کر اس میں مرچ نمک، ہلدی اور ہرا مسالہ ڈالکر کم آنچ پر ہنڈی میں پکاتے ہیں اور مسلسل ہلاتے ہیں۔ بعد کو سرخ مرچ زیرے اور لہسن کا بگار دیتے ہیں۔ ذائقہ دار کڑی خشکہ یا جوار کی روٹی، بیگن میتھی کے سالن کے ساتھ بڑی شوق سے کھائی جاتی ہے۔

۱۴- چگر: حیدرآباد کی خاص ترکاری ہے دراصل چگر املی کے کونپلوں کو

کہتے ہیں۔ دکن میں جنگلات میں یا پھر شہر کے باغات میں اِملی کے درخت کثرت سے اُگتے ہیں یہ ترش ہوتا ہے۔ گوشت کے ساتھ یا بمبل مچھلی جھنگوں کے ساتھ یا چگر بیگن یا چگر مرغ بھی پکایا جاتا ہے۔ روٹی یا خشکے دونوں ہی کے ساتھ مزا دیتا ہے۔

مرغ کا سالن: یہ پرندہ دکن کے پولٹری فارمس میں دستیاب ہوتا ہے۔ ویسے ہی گاؤں اور شہر کے اکثر گھروں میں زبِ قدیم میں مرغیاں اور بکریاں ضرور پائی جاتی تھیں۔

۱۵۔ مرغ کا سالن۔ قورمہ، دالچہ، بریانی وغیرہ حیدرآباد میں لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں جب کوئی مہمان آتے ہیں تو مرغ کے سالن اور بگارے کھانے سے مہمان کی ضیافت کرنا لازمی بات ہے۔ اور بڑے شوق سے یہاں کے لوگ مرغ کا سالن کھاتے ہیں۔ اکثر شیرمال یا تندوری روٹی کے ساتھ مرغ کا سالن کھایا جاتا ہے۔

۱۶۔ **انباڑے کی بھاجی**: حیدرآباد کی ترکاریوں میں پالک سویا، میتھی ترفے چکے کی بھاجیاں ہیں۔ لیکن انباڑے کی بھاجی خصوصیت رکھتی ہے غربا کے گھروں میں اکثر اور امرا کے گھروں میں وقتاً فوقتاً پکائی جاتی ہے جواری کی روٹی کے ساتھ یا چاول کے ساتھ کھانے کا ذائقہ بڑھاتی ہے۔ اس کا اچار بھی بنایا جاتا ہے۔ گوشت یا چنے کی دال کے ساتھ بھی پکائی جاتی ہے۔

۱۷۔ **کھٹی دال**: حیدرآباد کے ہر گھر میں تقریباً روزآنہ پکائی جاتی ہے کڑی اور دال بچے والی ہانڈیاں کہلاتی ہیں۔ دکن کا محاورہ ہے "دال بچے پال"

یہ مزہ دار اور سستا سالن ہے، اوڑد، مونگ اور چنے کی دال یہاں بہت ہوتی ہے لیکن مسور کی دال حیدرآباد میں پکتی ہے۔ یہ دال گلا کر کھٹا مرچی نمک اور ہرا مسالہ اور کریا پات ڈالتے اور بگھارتے ہیں۔ دال گلاتے وقت اگر نمک ڈال دیا جائے تو نہیں گلتی۔ دال کو گھوٹنی جو لکڑی کی بنی ہوتی ہے اس سے گھونٹتے ہیں۔ کھٹا ڈالکر خوب پکا کر ہی بگارا جاتا ہے کھٹا پکنے میں نمک ڈالا جاتا ہے

حیدرآباد میں پکوان ہوتے ہیں وہ مختلف ممالک کے پکوان یہاں شامل کردیئے گئے ہیں۔ جیسے ترکی، عربی، انگریزی، پکوان وغیرہ صرف دکن مخصوص کھانوں نے ہم نے یہاں ذکر کیا ہے۔

دسترخوان کی بدولت مل جل کر کھانے پینے کا رواج ہوا۔ اور مہمانداری کی رسم جاری ہوئی۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں مہمانداری اور میزبانی کے رسوم اور کھانوں کا معیار بالکل بدل گیا ہے۔

پہلے زمانے میں دعوتیں محلوں، دیوڑھیوں، گھروں اور باغوں میں ہوتی تھیں لیکن اب بنگلوں اور ہوٹلوں میں پرلطف صبح، ایٹ ہوم اور ڈنر ہوتے ہیں اس سے ہٹ کر قدیم طرز کے ولیمے، دعوت رو کی راور عیدوں کی دعوتیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس دور کی دعوتوں میں بڑی حد تک نمائش یا غرض کارفرما ہوتی ہے۔ شادی کا دسترخوان عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ نوشاہ کے دسترخوان کو خصوصیت سے جاتا ہے پہلے اور اس پر زردوزی کا کام ہوا کرتا تھا۔ کھانے کے لوازمات پر ورق ضرور لگایا جاتا تھا۔ کاج کاز (؟) کے کھانوں اور خصوصاً دولہا اور دولھن کے دسترخوانوں دعوتوں کے دستروں

پر بھی جو کھانے لگائے جاتے تھے چاندی کے ورق سے انھیں سنوارا جاتا تھا۔ پان کے بیڑوں اور میوے اجر مرسوم ہیں ورق کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔ اب یہ رواج چند ہی گھروں کی حد تک رہ گیا ہے۔

دولھا کے دسترخوان پر ایک آدھ میٹھے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے دولھے کے بیٹھنے کے لیے فرش پر بیچ میں مسند بچھائی جاتی ہے اور چھت پر منڈپ شادی میں اور دعوتوں میں جو دسترخوان بچھائے جاتے ہیں ان پر ایک ہی بیٹھک میں پچاس پچاس سو سو آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔

بعد کو چوکیوں پر بھی کھانا کھلائے جانے لگا اور لوٹے بھی اکثر رکھے جاتے ہیں لیکن مسلمان کھڑے ہو کر اس طرح کھانا پسند نہیں کرتے۔

مختصر یہ کہ دسترخوان تہذیبی زندگی کا اہم جزبن گیا ہے میزبانی اور مہمان نوازی حیدرآباد کا طرۂ امتیاز تھی۔ اب بھی امیر اور غریب سب ہی مہمان نوازی کرتے ہیں اور کمال رکھتے ہیں۔ پکوان بھی حیدرآباد میں ہنر کا کا درجہ رکھتا ہے

حیدرآباد کے رسم و رواج

پیدایش سے بلوغ تک کے رسم و رواج

ہماری زندگی ہر دور میں رسموں کی پابندی ہوتی ہے حیدرآبادی معاشرت میں تکلف نمود و نمایش شادی اور غمی کے تقاریب میں عیش و غم کے لامحدود ضابطے تھے۔ مختلف تقاریب اور دعوتوں میں موقع اور محل کے اعتبار سے لباس اور زیورات بھی مختص کر دیئے گئے تھے۔

رسم دراصل عربی لفظ رسم مونث ہے جسکے لغوی معنی نقش، نشان، دستور قاعدہ، آئین، قانون، ریت اور رواج کے ہیں۔

حیدرآباد میں قطب شاہی اور آصف جاہی ادوار میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ حیدرآبادی سلمانوں میں جو رسوم مروّج ہیں سب ہندوؤں کی دین ہیں۔ ان دونوں قوموں کے متحد ہو جانے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند اہم وجوہات یہ ہو سکتے ہیں کہ شمالی ہند کے اولیا و اکرم یہاں آکر سکونت اختیار کرلی تو ان میں سے اکثر اپنے خاندانوں کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو شاذ و نادر۔ چونکہ ان لوگوں نے یہاں کی نومسلم یا ہندو عورتوں سے جن کی گھٹی میں ہندی بقائد اور رسمیں پڑی ہوئیں تھیں، شادیاں کیں۔ یہ دلھنیں اپنے عقیدے اور رسم و رواج بھی اپنے ساتھ ہی لے آئے

تھے۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ یہ رسوم بے حد دلچسپ اور معنی خیز تھے اس لیے مسلمانوں نے ہندوؤں کے رسوم کو اپنا لیا۔

یہ بات بھی قابل لحاظ تھی کہ آدمی جس ملک میں رہ جاتا ہے وہ وہیں کا ہو رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حیدرآباد کے پانی کا کچھ ایسا ہی اثر ہے جو شخص بھی حیدرآباد آیا یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ حیدرآباد کے رسم ورواج، ردیہ، بول چال خوراک اور پوشاک تک اپنے آپ کو مانوس کرنے کی غرض سے اختیار کرجاتا ہے۔

آپس کے اتحاد سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں نے ایک مشترکہ تہذیب اختیار کی جسکا دونوں قوموں کی تہذیب پر بہت گہرا اثر پڑا۔ باہمی اتحاد اور اتفاق کی وجہ سے ہندوں نے بھی اہل اسلام کی اکثر باتیں اختیار کرلی تھیں۔ حیدرآباد ہی میں کیا بلکہ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے رسوم متحد اور مشترکہ ہو جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ دہلی میں مغل باشاہ جلال الدین اکبر جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر بادشاہ تھا اس نے استحکام سلطنت میں آپس کے میل ملاپ اور خلوص ومحبت کی بنا پر ہندی عقائد اور رسوم کو اختیار کرلیا تھا۔ جس طرح اس بادشاہ کے زمانے میں راکھی باندھنا، ہولی، دیپاولی اور دسہرے کا تہوار منانا مسلمان بادشاہوں کے شاہی خاندانوں میں عام دستور بن گیا تھا اسی طرح حیدرآباد میں بھی جو رسوم مروج تھے وہ شاہی خاندان والوں، امرائے سلطنت کے ساتھ ساتھ عوام بھی بڑے جوش وخروش سے مناتے تھے۔

بیوی کی صحنک جو مسلمان عورتیں شادی کے آغاز پر بڑے عقیدے سے مناتی

ہیں یہ خالص جودھا بائی کی ایجاد ہے۔

حیدرآباد میں جب کسی مسلمان کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے گیت کرشن جی کی پیدائش کے گائے جاتے ہیں۔ بچہ کی پیدائش پر مسلمان عورتیں بھی یہ گیت گایا کرتی تھیں۔

سے البیلے نے مجھے درد دیا :: سانولے نے مجھے درد دیا۔ یا یہ سے
سہاگن چچا ماں کرے نندلال سے :: یہاں نندلال اور سانولا دونوں کرشن جی سے مراد ہے۔

بچہ پیدا ہونے کی رسمیں :-

۱۔ ستواسہ :- ایام حمل میں بہت سی علامتیں ظاہر ہوتی ہے جیسے کے آغاز حمل میں عورت کا سر چکراتا ہے۔ سستی اور کاہلی چھا جاتی ہے۔ دن بھر سونے پڑے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ جی متلاتا ہے اور ابکائیاں آتی ہیں۔ تب یہ علامتیں دیکھ کر عورتوں میں مبارک سلامت شروع ہو جاتی ہے۔

حمل کے سات مہینے پورے ہونے پر ستواسہ کا رسم کرتے ہیں۔

سات طرح کی ترکاریاں میوے پکوان وغیرہ میکے والے دلہن (حاملہ) کا جوڑا کنگن، عطر، پھول، تیل کی کٹوری، لال اور دھنی، سندور کا نیگ، مجزی وغیرہ لاتے ہیں۔ حاملہ کو سرخ کپڑے بدلتے ہیں۔ پھول پہنا کر سندیں اسکی گود بھرتی اور اسکو ہری کانچ کی چوڑیاں پہنائی جاتی ہیں۔ اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ گود بال بچوں سے ہری بھری رہے۔ یہ رسم ہندوں کی ہے۔ مسلمانوں میں بھی رائج

ہے ۔ بعض لوگوں ستواسہ اور بعض نوماسے کو لوگ بھرتے ہیں ۔ پرانے زمانے میں عورتیں دواخانوں میں زچگی کروانا معیوب سمجھتی تھیں ۔ اسلیئے زچگی گھر ہی پر ہوا کرتی تھی ۔ حیدرآبادیوں میں ایک عام رواج کے مطابق سات مہینے نکلتے ہی دولہن کو میکے بھیج دیا جاتا ہے ۔ کیونکہ پہلی زچگی کروالنے کا حق ماں باپ کا ہے ۔ جب درد زہ لگتے ہیں تو زچہ کے پلنگ کا رُخ بدل دیتے ہیں ۔ سرپائنتی کی جانب کردیتے ہیں ۔ غرض کہ جننا اور مرنا دونوں برابر ہیں ۔ چناچہ زچگی کے وقت بزرگ عورتیں بہت پریشان رہتی ہیں ۔

پہلے زمانے میں ایک عجیب رواج تھا کہ اگر کسی کو بچہ بچہ پیدا ہو تو کہتے تھے کہ بچی پیدا ہوئی ۔ اور زچہ سے کہتے تھے کہ بچی ہوئی اور کانڑی ہوئی تاکہ اس غم کی گرمی سے آدنل جلد نکل آئے ۔ بچے کا کٹا ہوا نال گھر کے آنگن میں گاڑ دیا جاتا ۔

زچگی ہو جانے کے بعد دائی کو انعام دیا جاتا ۔ امیروں میں سونے یا چاندی کے کڑے حسب حیثیت دولہن کے میکے والے یا سسرال والے دائی کو دیتے تھے ۔ بچہ پیدا ہوتے ہی زچہ کے سر پر ڈھاٹا باندھتے ۔ بچے کو نہلا کر سر کو چاروں طرف سے دبا کر گول کر دیتے یا ایک پرانے ململ کا ڈھاٹا اسکے سر کو باندھتے اور ناک کو اٹھاتے تھے تاکہ ہوا لگنے سے دھبہ ڈہل نہ ہو جائے ۔ بڑے بڈھوں کے پہنے ہوئے کرتے کو چاک کر کے بچے کے گلے سے پہناتے تھے ۔ ایسے کفنی کہتے ہیں ۔ خاندان کا کوئی بزرگ شخص یا مرشد بچے کے کان پر اذاں دیتا ۔ اور کھجور سے سے شہد چٹاتے ۔ اگر بچہ ہو تو محمد اور اگر بچی ہو تو فاطمہ کہہ کر بچے کے کان میں پکارنے کا رواج تھا ۔ زچہ کے پیٹ کو پٹی باندھتے تھے ہندوں میں بچے کی پیٹھ تھپک کر کان میں کسی ایک بھگوان کا لیکر

پکارتے۔ مسلمانوں میں ساتویں دن عقیقہ کرتے اور نام رکھائی کی رسم کرتے ہیں۔
ہندوں میں تیسرے دن کے بعد سے اکیسویں دن تک بچہ کا نام رکھ دیتے ہیں۔
بچہ کو پہلے دن شہد، دوسرے دن گھٹی اور تیسرے دن ماں کا دودھ پلایا جاتا تھا
بچہ کی پھوپی چھاتی اور لٹ دُھلانے کی رسم انجام دیتی اور نیگ لیتی تھی اسی روز دولہے
کی کوئی بہن رچھوانی بنا کر بچے کو پلاتی تھی۔ اور نیگ لیتی جس روز بچہ پیدا ہوں اس روز
سے ہر شام میں مرچی کا اور اجوان کا دھواں دیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ چھٹے کے دن تک رہتا۔
جس روز بچہ پیدا ہوا اس رات میں زچہ کو سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ اور نہ کروٹ بدلنے
دیا جاتا تھا۔ زچہ کو بیدار رکھنے کی خاطر رات بھر عورتیں ڈھول بجاتیں بعد زچہ گیریاں
گاں یا کرتی تھیں۔

چھٹی:۔ بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن چھٹی کی رسم ہوتی اس دن زچہ
بعد بچہ کو نہلاتے ہیں۔ اتارا ہوا جوڑا زچہ دائی کو دے دیتی ہے۔ چھٹی کے دن کسی
کے خبر دیتے ہی ہجیرے آ دھمکتے تھے اور ناچ گانا کرتے۔ چھٹی کے دن کھچڑی اور ہری
ماٹھ کی بھاجی پکا کر زچہ کو کھلاتے اور رشتہ داروں اور محلے میں تقسیم کیا جاتا تھا۔
اگر لڑکا ہو تو لڈو اور لڑکی ہو تو بتاسے ورق لگا کر اور پان اور بڑی سپاری کے
ساتھ کسی کشتی میں رکھ کر اس پر نام رکھائی کی چاندی کی تختی جس پر بچہ اور بچہ کے والد
کا نام اور تاریخ ولادت کھدا کر تقسیم کرتے اور اس حصہ کو لیکر ماں، چاول، پان اور
کچھ روپیے خالی برتن رکھ کر واپس کرنے کا رواج عام تھا۔ بچے کا ننھیال سے چھٹی کی
رسم آتا جس میں بچے کے لیئے کپڑے چاندی کے والے پھول وغیرہ ہوتے۔ رات میں
دائی بھانڈے کے رسم کرتی۔ بھانڈہ بچے کی تو ویں بھرا جاتا۔ ایک تھالے چاول

دال، رندہ، مچھلی، لہسن۔ تیل وغیرہ رکھ کر دائی بھانڈا بھرتی ایک وہم تھا کے اگر بھانڈا نہ بھرا جائے، تو بچہ کنگال نکلتا ہے۔ اس رات دائی رانڈی کے تیل سے چھری پر کاجل پکڑتی اور زچہ، بچے اور بچہ کے باپ کی آنکھوں میں لگاتی اور رقوم لیتی۔

عقیقہ یا منڈن:۔ عقیقہ مسلمانوں کی مذہبی رسم ہے۔

ہندوں میں بچے کے بال نکال کر نام رکھنے کی رسم کو منڈن کہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی دیول کو جاکر بچے کو بال کھلواتے ہیں۔ یا پھر گھر ہی یہ تقریب انجام دی جاتی ہے۔ اکثر حیدرآبادی ہندو لوگ جہانگیر پیراں کی درگاہ کو جاکر بچے کے بال نکالتے ہیں۔ اور نیاز کرتے ہیں۔ یا پھر حضرت بابا شرف الدین صاحبؒ کی نیازی کو جاکر نیاز کرتے بال نکالتے ہیں۔ اکثر دیہاتی مسلمان بھی اسی طرح سے بچوں کے بال نکلواتے ہیں۔ اگر یہ نیاز وقت پر ادا نہ ہوسکے تو ایک چیٹو یعنی سر کے کچھ بال منت کے طور پر بچے کے سر پر چھوڑ دیتے ہیں اور سہولت سے منت پوری کریں۔

عام طور پر مسلمانوں کے پاس عقیقہ کی رسم گھر ہی پر ہوتی ہے۔ بچی ہو تو ایک بکرا اور بچہ ہو تو دو بکرے ذبح کیا جاتے ہیں۔

سرکار دو عالم نے اپنے دونوں نواسوں کا عقیقہ پیدائش کے ساتویں دن کیا تھا اور خود اپنا عقیقہ بھی آپ نے سات کیا اور قربانی گوشت تقسیم فرما کرایا تھا۔ عقیقہ کی قربانی مولود کی سلامتی کا صدقہ ہے جو جسم کے عوض جسم اور روح کے عوض روح دی جاتی ہے۔ چونکہ صدقہ دے کر اسے اپنے تصرف میں لانا درست نہیں اس خیال سے ماں باپ، نانا نانی، دادا دادی، عقیقہ کا گوشت نہیں کھاتے۔ نائی کو چاندی کی کٹوری اور بچے کے سر کے بال تول کر اسکے وزن

کے برابر چاندی خیرات کر دی جاتی ہے ۔ عقیقہ کی اس رسم میں بچہ کے گلے میں لال مدرسے کا کپڑا ڈالتے ہیں ۔ نائی اور بچہ کے گلے میں پھول کا ایک ایک ہار ڈالتے ہیں ۔ نائی یا حجام پہلے بچے کے بال بھگاتا ہے اور سر پر استرا رکھتا ہے ۔ ادھر قصائی بچے کا نام لیکر اللہ اکبر کہہ کے بکرے گلے پر چھری پھیرتا ہے ۔ یہ رسم نہیں ہے بلکہ شرعی حکم ہے ۔

بچہ کی نام رکھائی تو چھٹی کے دن ہی ہو جاتی ہے ۔ بچہ کے سر کے بال کو چاندی میں تولے جاتے ہیں ۔ اور وہ چاندی خیرات کر دی جاتی ہے اور دن مالاں کو اختیار کے ساتھ دفن کر دیا جاتا ہے ۔ جہاں بال اگر کسی سانپ لگے تو جادو یا ٹونہ مرنے کا ڈر سمجھتے تھے جو توہمت کے سوا کچھ نہیں ۔

ہندوؤں اور مسلمان دونوں میں زچہ کو کچھ دن تک الگ ہی رکھتے ہیں اور کوئی اسکو ہاتھ نہیں لگاتے اسکو چھوت کہتے ہیں ۔ ان دنوں میں زچہ کو ناپاک خیال کرتے ہیں ۔

ہندو میں اکیسویں دن اور مسلمان میں چالیس دن تک زچہ جس گھر ہو وہاں پوجا پاٹ فاتحہ درود وغیرہ نہیں جاتی ہے ۔

چھلہ :۔ زچہ ساتویں، بارھویں، بیسویں ایک ہفتہ اور چالیس دن نہاتی ہے ۔ چالیسویں دن پانی نہا کر معیاد زچگی سے وہ فارغ ہو جاتی ہے ۔ جب دائی بھی رخصت ہو جاتی ہے ۔ دائی کو کپڑوں کا جوڑا اور انعام دیا جاتا تھا ۔ چونکہ موجودہ زمانے میں حیدرآباد میں بہترین دواخانے سرکاری اور خانگی قائم کیے ہیں اب وہ ماہمتا نہیں رہیں چونکہ یہاں پر آجکل بچوں کے ڈاکٹر بھی ہیں تو خانگی

ڈاکٹروں کے مشورے سے بچوں کی دیکھ بھال اور طبی اصولوں پر کرتی ہیں۔

اور خود تیار یہاں غیر ضروری اور فضول رسموں کی ترک کرتی جارہی ہیں البتہ تمام مذہبی رسوم ضرور کرتا ہے۔

چھلّہ کے روز جھولے کی رسم بھی کی جاتی ہے۔ سنتھیاں سے جھولے کا رسم آتا ہے جس میں بچے کے لیئے ضروری اشیاء بھی بھیجے جاتے ہیں۔ بچے کو جھولے میں ڈالتے وقت مراثیاں جھولے کے گیت گاتی ہیں۔ حیدرآبادی طریقے کے مطابق چھلہ کی رات کلپوشی کے بعد زچہ رہنے سسرال چلی جاتی ہے۔

بہر ال امیر گھرانوں میں بچہ کی سنبھال اور دیکھ بھال کے لیئے میم۔ نرس جو کرسچن ہوتی تھیں مقرر کی جاتی ہے یا پھر آیا اور انا اور غریب گھرانوں میں صرف مائیں ہی رہتے بچوں کی پرورش کرلیتی۔ بہرصورت ماں رہتے بچے کی نگرانی رکھتی۔

بچہ گھر والوں اور خاندان والوں کے لیئے ایک جیتا جاگتا کھلونا ہوتا ہے۔ جب وہ ہوں نماں کرنے لگتا ہے اور مختلف آوازیں نکالتا ہے اور مختلف طریقوں سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ تو ماں باپ ہی کیا سارے گھر والوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ صاف ستھرے بچے بہت دلکش لگتے ہیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو ارنڈی کے تیل کا جلاب دیا جاتا تھا اور بڑے لوگ بھی تیل کا جلاب لیتے تھے۔ لیکن بعد کو یہ رواج متروک ہوگیا۔ دایا یا آیا کی روزانہ تیل کی مالش کے بعد نہلاتی تھی۔ بچے کے لیئے ہر قسم کے جتن کیئے جاتے تھے۔ نہلانے کے بعد بچے کی بائیں کن پٹی اور بائیں تلوے میں کاجل کا ٹیکہ لگاتے تھے تاکہ ایسے نظر نہ لگے

بوشہ چٹھادن کی رسم اس وقت کی جاتی ہے جب بچہ کی عمر چار ماہ چار دن کی ہوجائے۔

اس دن کھیر اور کئی قسم کے پکوان کئے جاتے ہیں۔ بچے کا ماموں چاندی کی کٹوری میں کھیر لیکر اپنی کلمے کی انگلی سے بچہ کو چٹاتا ہے۔ اس رسم میں قریبی رشتے دار جمع ہوتے۔ بچے کی گلپوشی کرتے ہیں مختصر سی دعوت کی جاتی ہے۔

سالگرہ :۔ اس طرح جب بچہ ایک سال کا ہو جائے تو اسکی سالگرہ کی جاتی ہے۔ سالگرہ کی تقریب میں مخصوص رشتے داروں اور خصوصاً بچوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اور پہلی سالگرہ وقت بچے کو مسند پر بٹھاتے ہیں اور ایک چاندی کا چھلہ پہنا تے تھے اور ایک لال ناڑے کی بڑی پنڈل پہنواتے لال ناڑے میں پان اور مسری درپ کو موڑ کر گلپوشی کے بعد بچے کی پیشانی سے لگا کہ گرہ دی جاتی تھی اس لیئے ہر سال بچہ پیدائیش کے دن کی خوشی منائی جائے تو اسے مسلسل گرہ کہتے ہیں۔ سہرے گیتوں اور نغموں کے بیچ گلپوشی صندل لگا کر کرتے اور اس تقریب میں عقیدہ منایا جاتا تھا۔ مختصر سے پکوان کے جاتے اور مسلمانوں کی ضیافت کے بعد جب گلپوشی کی رسم ہوتی تو رشتے دار تحفے اور سلامی دے کر رخصت ہو جاتے چوتھی سالگرہ کا اسم پھوپی لاتی ہے۔

حیدر آباد میں ایک عرصے سے اس تقریب میں انگریزی طریقے پر کار شامل ہو گئے ہیں۔ بچے کو آجکل پھول پہنا تے ہے۔ اور کیک کٹواتے ہیں۔ اور پہلے برس ایک موم بتی اور دوسرے برس دو اس طرح جتنے سال کا بچہ ہو اپنی خوبصورت موم بتیاں کیک پر ہی چسپاں کی جاتی ہیں۔ بچہ جب کیک کاٹتا ہے تب موم بتی کو جو سلگائی جاتی ہے منھ سے پھونک کر بجھاتا ہے۔ جب سب مہمان ہیاپی برتھ ڈے کہتے ہیں۔ تالیاں بجائی جاتی ہے۔ ٹیبل پر خوبصورت گلدستے بھی سجائے جاتے ہیں۔ شام میں پانچ بجے یہ سالگرہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ڈنر در نہ ایٹ ہوم پر ہی یہ تقریب اختتام کو پہنچ

جاتی ہے۔

دودھ چھوڑنی کی رسم :- جب بچہ ڈھائی سال کا ہو جائے تو انا کا دودھ چھڑاتے وقت بچے کے پیر میں سونے کے گھنگرو ڈالتے ہیں انا کو کپڑے دلاتے ہیں۔

ختنہ :- مسلمانوں میں مرد بچوں کی ختنہ کرائی جاتی ہے اسکا رواج حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چلا آرہا ہے اس وجہ سے اسکو سنت ابراہیمی بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک شرعی رسم ہے۔ حیدرآباد میں ختنہ کی رسم بھی بڑے چاؤ دل سے کرتے ہیں۔ ختنہ کی رسم سے قبل بچے کو مانجے بٹھاتے ہیں۔ بچے کو تین چار روز تک مانجے بٹھانے کے بعد ختنہ کی رسم کی جاتی ہے۔ جس کمرے میں ختنہ کے دولھے کو مانجے بٹھائے جاتے ہیں اس کمرے کو سجایا جاتا ہے منڈپ چھت سے باندھی جاتی ہے۔ کمرے میں زرد رنگ کا فرش کیا جاتا ہے۔ ختنہ کے دن منڈپ کے بیچ چوکی رکھی جاتی ہے۔ بچہ کی ختنہ قدیم زمانے میں نائی گھر پر آکر کرتا تھا۔ آجکل لوگ دواخانوں میں بھی ختنہ کر دلاتے ہیں۔ بچے کو سرخ رنگ کی لنگی جس کے کناروں کو روپہری پٹی ٹانکی جاتی ہے پہناتے ہیں۔ قریبی رشتہ دار جمع ہوتے ہیں۔ بچے اور نائی کی گلبوشی کی جاتی ہے۔ یہاں یہ رواج قدیم سے چلا آرہا ہے کہ جب بچے کی ختنہ ہوتی ہے اس وقت ماں کے سر پر روٹی اور آسان رکھ کر ایک پیر پر کھڑا کرتے ہیں اور ماں اللہ سے اس مشکل کو آسان ہونے کی دعا کرتی ہے۔ چنانچہ میرے لڑکوں عرفان اور آصف کی ختنہ کے وقت میری نانی جان' والدہ' خالدہ ماں وغیرہ رو رہے تھے اور میرے سر پر روٹی رکھ کر دعا مانگنے کے لیئے کہہ رہے تھے۔ عین ختنہ کے وقت بچے کو نائی یوں بہلاتا ہے کہ دیکھو سونے کی چڑیاں اڑ رہی ہے۔ ختنہ کے دن سے گیارہ اور اکیس دن کو ماں باپ گلبوشی کرتے ہیں۔ ویسے تو ان اکیس

دنوکوئی نہ کوئی رشتہ دار معالمت احباب وغیرہ بچہ کیلئے ہریرہ روٹی سوکھا میوہ بچہ کے لیئے قیمتی کپڑے پھول وغیرہ باجے یا ناشامرفی کے ساتھ کشتیوں میں سجا کرلاتے ہیں۔ ختنہ کے دولہے کی بارات گھوڑے پر اس رسم کو گھوڑی چڑھانا کہتے ہیں۔
دن نکالتے ہیں۔ اسی دن گھر والوں دعوت کا استمام کرتے ہیں۔ "زنار کی رسم" ہندو حضرات میں برہمن اور کوشٹی لڑکوں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے کچھ پہلے ہی "زنار" کی رسم کرتے ہیں۔

اس رسم میں بچہ کو مقدس ڈھاگے باندھا جاتا ہے جسکے پہننے کے بعد لڑکے پر مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ہندوں کی مذہبی رسم ہے۔ شاستری سے یہ رسم ان پر فرض ہے۔ یہ رسم ہندو لوگ بہت دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ اور بڑے پیمانے پر دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس رسم کو گود بھرائی بھی کہتے ہیں۔ اس موقع پر پنجری بنا کر خاندان میں تقسیم کی جاتی ہے۔

کان چھیدائی اور ناک چھیدائی کی رسم :-

جس طرح مرد بچوں کی ختنہ کی رسم کرتے ہیں لڑکیوں کے لیئے کان چھیدائی اور ناک چھیدائی کی رسم بھی کی جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں لڑکیوں کے کانوں میں پانچ پانچ چھ چھ سوراخ کیئے جاتے ہیں۔ اور کان بھر کر زیور پہنے جاتے تھے۔ جیسے کہ نکے پھول چھ پھول رتنی وغیرہ اور ناک میں بھی سوراخ کیا جاتا تھا۔ اور اس ناک میں ناک کی دال یا چھوٹی سی بالی پہنائی جاتی تھی۔ چنانچہ اس رسم میں مختصر سی دعوت کرتے ہیں۔ اور محلے کے خواتین اور رشتہ دار خواتین بھی گڑ، کھوپرا لاکر اس تقریب میں شریک ہوتی ہیں۔ ہندو خواتین بھی یہ رسم تقریباً اسی انداز سے انجام دیتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ

ناک چھیدائی کی ابتدائی حضرت بی بی ہاجرہ سے ہوئی ہے۔ جب بی بی سارا نے ان کی ناک چھیدائی تھی تاکہ وہ بدصورت دکھائی دیں۔ لیکن جب انکی ناک چھیدائی گئی تو وہ بہت خوبصورت لگنے لگیں اس طرح زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے بھی یہ رسم چلی آئی ہے لیکن آج کل دونوں کی صرف لوکیوں میں سوراخ کرتے زیور پہنتے ہیں اور ناک میں بائی جانب سوراخ کرتے ہیں۔

تسمیہ خوانی یا بسم اللہ کی رسم ۱؎

حضور صلعم کی شق صدر کی تاریخ پر تسمیہ خوانی کا رواج پڑا۔ یہ پہلا شق صدر ہے جو حضور صلعم کو بچپن ہی میں ہوا۔ اس آپ کی اس بچپن کی شرح صدر کی سند لے کر مسلم متاخرین نے اپنے بچوں کی تسمیہ خوانی کی مدت چار سال چار ماہ چار دن ٹہرائی ہے۔ اور اسی دن بچوں کی بسم اللہ کے ساتھ سورہ فاتحہ سورہ بقرہ کی پہلی پانچ آئتیں جو جبریل علیہ السلام حضور اکرم کو پہلی بار پڑھائی تھی۔ بچے کو پڑھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے ثواب دارین حاصل کریں۔ اور اس دن کے محیض سے بچوں کو ممتاز کیا جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ کلام پاک کے طفیل میں بچے کا شق صدر ہو جائے اور وہ عالم یہ عمل بن جائے۔ بسم اللہ کے دن سے بہت روز قبل سے اس رسم کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ امرا میں ہزاروں روپیئے خرچ کرتے ہیں۔ لغنا اور چھوٹے گھرانے کے مسلمان بھی بسم اللہ کی رسم کو دھوم دھام سے ایک چھوٹی موٹی شادی کے انداز پر کرتے ہیں۔

چار دن پہلے سے رت جگہ اور منجھے کئے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں گھر پر چار دن پہلے ہی سے نوبت بٹھائی جاتی تھی۔ رقعے چھپتے مکان سجایا جاتا۔ جھاڑوں اور

رسم تسمیہ خوانی

باغ میں

باغ میں روشنی کی جاتی۔ گھر کو طرح طرح سے سجایا جاتا۔ منڈپ باندھی جاتی۔ قریبی رشتہ داروں کو تیاری کے لیئے چند روز قبل ہی بلالیا جاتا۔ نہوتے پہیوکے ہول۔ جوڑی کے جوڑے تیار کروائے جاتے۔ بسم اللہ کے بچے کے لیئے پہلے ہی سے کپڑے سلوائے جاتے۔ درزی خود ہی گھر پر بلالیا جاتا۔ اگر لڑکی ہو تو سات سہاگن بنگ لے کر بجی کی کپڑے ستیں۔ اور سلائی ہوتی۔ زرین قیمی . کرتا کا پاجامہ۔ چیڑادی جوتا تیار کیا جاتا۔ منجوں کے لیئے بھی زرد رنگ کے بھاری کپڑے سلائے جاتے۔

منجوں سے ہی روزانہ مراثیاں بلائی جاتیں۔ چھوٹے گھرانوں میں عورتیں ڈھولک کے گیت گائیں۔ رسم کے موقع پر عجیب اہتمام کیا جاتا۔ صاحب کانہ بڑے جوش و خروش سے استقبال کرتیں۔

پہلے زمانہ میں حیدرآباد میں زمانے کو مدعو کرنے کے لیئے کسی مغلانی کے ہاتھ سے کی کشتی میں الاچی رکھ کر اس پر طورۃ پوش اڑا کر دعوت دینے بھیجا جاتا تھا مغلانی دیوڑھی میں پہنچا تو اجازت لیکر اندر پہنچائی جاتی۔ سلام و آداب کے بعد بہت ہی ادب سے دعوت پہنچائی جاتی۔ خیر و عافیت پوچھی جاتی۔ اور دعوت میں شریک ہونے کی رضامندی ظاہر کی جاتی تھی۔ بعد کو رقعوں کا ہوا۔ بسم اللہ کا بچہ ہو تو اسکے لیئے بھی زرد کرتا رنگا جاتا۔

مکان کا فرش وغیرہ بھی زرد رنگ کا رنگا جاتا تھا۔ دولھا کے لیئے سفید جوڑی دار پاجامہ، دستار، کمخواب یا شجرۃ شروانی۔ جاتا ہے چڑملو کا جوتا۔ ایک کشتی میں رکھا جاتا۔ رسم کی کشتی تیار کی جاتی۔ پھول رکھنے کے لیئے خوبصورت

چنگیر ہوتے۔ جن پر خوبصورت سرخ مخمل کا طرہ پوش ہوتے۔ رشتے داروں کے پاس سے مانجے آتے۔ بچے کو مہندی لگائی جاتی۔ ادھر مہمانوں برسی آئی پانی سے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ بنے بیٹھے آتے ان کا خیر مقدم کیا جاتا۔ ہلدی وغیرہ لگا کر بچے کا رسم کرتے پانی نہلاتے پھر بعد مغرب کلاج کے کپڑے بسم اللہ کہکر پہناتے رسم کے لئے کار چوبی سرخ مسند تلے لگا کر بچے کو بٹھایا جاتا۔ بسم کے لڈو بہت بڑے بڑے تیار کر کے ساتھ تانا نانی باجے کے ساتھ لے آتے ہیں۔ بچے کو سہرا باندھتے نقول بنانے بسم اللہ پڑھاتے وقت گانا بجانا موقوف ہو جاتا لڈو پر سونے یا چاندی کے پتر پر سورۂ اقرا لکھی جاتی بچے کے سامنے رکھ کر بسم اللہ کہے و بچہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی بولی سے انھیں الفاظ کو دہراتا۔ بعض وقت بچے بسم اللہ نہیں کہتے۔ ضد میں آجاتے ہیں۔ خوب روتے ہیں۔ بسم اللہ پڑھانے کے بعد بارات نکالی جاتی ہے جسے گھوڑی چڑھانا بھی کہتے ہیں۔

قرآن خوانی کی رسم: بچوں کے قرآن ختم کرنے پر بھی ایک رسم یہ کیجاتی ہے کہ استاد کو دعوت کر کے ان کو نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں بچے اور استاد کی بھی خوشی کی جاتی ہے۔

روزہ رکھائی: جب بچہ (۹) یا (۱۱) سال کا ہو جائے تب اسکی روزہ رکھائی کی تقریب کی جاتی ہے۔ بچہ کو سحری کراتے ہیں روزہ رکھواتے ہیں سحر کے وقت قریبی رشتہ دار بچے کے ساتھ سحری کرتے کے سحر میں کھچڑی قیمہ۔ پاپڑ اچار اور ستر قورمہ اور سوبارہ تیار کرتے بچے کو سحری کرواتے ہیں۔ بچے کی گل پوشی کی جاتی ہے اور نیت کروائی جاتی ہے۔ دن بھر

بچے کی نگرانی کرتے ہیں تاکہ بچہ غلطی سے پانی وغیرہ نہ پی لے۔ دن بھر بچے کے بھلانے کے لئے یا تو اسے کسی تفریح گاہ کو لے جاتے ہیں۔ وقت شام مہمان جمع ہوجاتے ہیں افطاری بھی کی جاتی تھی۔ میں رشتہ دار خصوصاً ننھیال والے جامہ کے ساتھ سجا کر لاتے تھے۔ افطاری میں کھجور یا چھوارے، کیلا اور سوکھا میوہ چینی اور گھاس کا فالودہ، کھیر، روٹی، دال، چنے کی ابلی ہوئی۔ جس کالی مرچ سونٹھ، ہرا مسالہ نمک وغیرہ مناسبت سے ڈالکر تیار کرتے ہیں یہ روزآنہ بھی افطار میں ہر گھر میں تیار کی جاتی ہے۔ دہی بڑے۔ ہر قسم تلن کی چیزیں لائی جاتی ہیں اور اس قسم سے صاحب خانہ بھی افطاری تیار کرکے اسی روز مسجد کو بھی بھیجتے ہیں اور مہمانوں اور غریبوں کو بھی کھلاتے ہیں۔

بچے کو افطار کرواتے وقت گل پوشی کرتے ہیں قیمتی کپڑے بدلواتے ہیں مہمانوں کی لوازمہ کے ساتھ ضیافت کی جاتی ہے۔ بلوغت کی رسمیں کسی حیدرآبادی کے گھر لڑکی جوان ہوئی تو اس کو مانجے بٹھا دیتے ہیں رشتہ دار بھی اس کیلئے مانجے لاتے ہیں۔ شہروں میں بھی ایسی ہی رسمیں کی جاتی ہیں۔ دراصل یہ اعلان ہے کہ ان کے گھر بھی بچی شادی کے قابل ہوگئی ہے۔

حیدرآباد میں تو سماٹ زندگی کے ہر پہلو کے ساتھ اس کے خصوصاً کاج کارن کے وقت دن دیکھے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ہندوؤں کے پاس تو ہے ہی لیکن یہاں کے مسلمان بھی نجومیوں اور جوتشیوں سے رجوع ہوتے ہیں وقت اور گھڑی دیکھ کر کام کرتے تھے۔ شادی کی تاریخ محرم، صفر میں نہیں ٹھہرائی جاتی تھی۔ شادی جمعہ، پیر، اتوار، اور جمعرات کے کسی ایک دن

ٹھہرائی جاتی۔ چہارشنبہ اور منگل اور ہفتہ کے دن کو منحوس تصور کرتے تھے۔

رسم و رواج کی ابتدا شاہی درباروں میں شروع ہوئی۔ محلوں سے یہ رسوم امراء کے ساتھ ان کے گھرانوں میں بھی شروع ہوگئے اور پھر عوام نے بھی خوشی خوشی انہیں اپنا لیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملے ملے رسوم کی ابتدا اس وقت شروع ہوئی جبکہ دہلی میں مغل اعظم جلال الدین اکبر کی شہنشاہت تھی۔ یہ لگ بھگ وہی زمانہ ہے جبکہ حیدرآباد دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ حکومت کررہا تھا۔ اکثر رسوم کو شہنشاہ اکبر نے ہندوؤں کی مطبوعی کے لئے رائج کر رکھا تھا۔ اکبر کو یہ خیال تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے ہندوؤں کے رسم و رواج کو مٹانے کی فکر اور تعصب کا اظہار سلطنت کے لئے کسی بھی طرح مفید نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ مذہب اسلام کی وجہ سے ہندوؤں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو اس لئے دربار شاہی میں اکبر نے ایسے دستور جاری کئے جو ہندو راجاؤں کے دربار میں مروج تھے۔

آج کل ہماری تہذیب اتنی ترقی کر گئی ہے کہ ہندو بھائی بھی ناپسندیدہ روایات کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شادی کے تعلق سے صرف لڑکے اور لڑکی کی آپسی رضامندی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے لیکن پہلے زمانہ میں یہاں ان کی رضامندی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ملک میں دونوں کے بزرگوں کی رضامندی پر منحصر ہوتی تھی۔

شادی بیاہ کے رسوم

شادی بیاہ کا تعلق صرف لڑکے اور لڑکی سے ہے لیکن پہلے زمانے میں انکی ذات سے ہٹ کر خاندان قبیلے اور قوم پر سب کی نگاہیں پڑنے لگتی ہے۔ "ہے جستجو کہ خواب ہے خوب تر کہاں جس گھر میں سیانی لڑکی ہو وہاں پیام ضرور آنے لگتے ہیں شاید کے ذریعہ شادی طے پاتی ہے پرانے زمانہ میں جب کسی کے گھر بچی ہو تو بچپن کے زمانے ہی سے اس کے لئے جہز جمع کرنا شروع کردیتے تھے۔ کہتے تھے بچی گہوارے میں "جہیز پٹارے میں" دولہے کے متعلق سہرے جسی تفصیلات ایک رنگین کاغذ پر لکھ کر جس کو اسم نویسی کہتے ہیں مشاطہ کے ذریعہ لڑکی کے گھر بھیجے جاتے ہیں قدیم حیدرآباد میں اسم نویسی کو خوشبودار مخمل کی تھیلی میں رکھ کر مشاطہ کے حوالے کی جاتی تھی۔ اب اس کا اتنا رواج نہیں رہا۔ مسلمانوں میں لڑکے کی طرف سے پہل جاتی ہے لیکن ہندوؤں میں پیام کی پہل لڑکی کے ماں باپ کی طرف سے ہوتی ہے جب خوب چھان بین اور دریافت ہو جاتی ہے۔ تب لڑکی والے نام نویسی بھیجتے ہیں لڑکے والے جب لڑکی کو دیکھنے آتے تو اس کے ہاتھ پاؤں صورت کے ساتھ ساتھ بال بھی دیکھتے۔ ہاتھوں کی لکیریں بھی دیکھتے۔ جب لڑکی پسند آجائے اور دین لین بھی اچھا ہو تب ہی رشتے کی

بات پکی ہوتی ہے۔ اچھا دن تاریخ وقت وغیرہ دیکھ کر منگی کی رسم کی جاتی ہے

منگی کی رسم شادی بیاہ کی سب سے پہلی یہ چھوٹی سی تقریب کی جاتی ہے۔ اس رسم میں لڑکے گھر سے رشتے خواتین رسم کی کشتیاں جس میں میوہ اور میٹھائی کی ٹوکریاں ہوتی ہیں. تاشا مرفے کے ساتھ شام کے وقت دولھن کے گھر آتے ہیں اور اس کو پھول پہنا کر کچھ زیور لڑکی کو اپنے ہاتھ سے پہناتے ہیں۔ اس کو چڑھاوا کہتے ہیں چڑھاوا ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نذر کے ہیں۔ منگنی کے رسم کے دوسرے دن دولھن دولھے کے گھر جاتے ہیں۔ وہاں بڑے اخلاق اور مروت کا مظاہرہ ہوتا ہے دولھن والوں کی طرف سے دولھا کو چڑھاوا دیا جاتا ہے۔ یا پھر دولھن کے رسم کے بعد کچھ رقم میٹھائی اور انگوٹھی دولھا کے لئے بھیج دیجاتی ہے جسکو بیڈ کہتے ہیں۔ یہ تلگو یا بلدن کا لفظ ہے۔ تلنگی میں پنڈلی شادی کو کہتے ہیں ہندوؤں میں ایسا ہی رواج ہے جس کو واکدان کہتے ہیں۔ ہنڈیا دکشنا یا گھوڑے جوڑے کے نام سے ایک معینہ رقم دولھن کی جانب سے دولھا کو دی جاتی ہے۔ اب روشن خیالی کی وجہ سے اس رسم میں کچھ تبدیلی آگئی ہے آج کل پاؤں میز کے دن دولھا والے دولھن کے ناپ کا جوڑا اور چپل خریدنے کے لئے موتیوں کی لڑی سے اس کے پاؤں کا ناپ لیتے ہیں اور بڑی جوڑیاں لاکر چوڑی کا سائز لے جاتے ہیں۔ دولھا کے لوگ شکرانے کے خوان جیسے میٹھائی پھول اور رسم کی کشتیاں اس رسم کے لئے آتے ہیں. اس رسم کی تکمیل کے بعد دولھا اور دولھن کے گھر میں ہلدی پھوڑنے کی رسم کی جاتی ہے چکھی کے گیت گا گا کر عورتیں ہلدی پیستی ہیں شادی کے جہیز کو ایک لمبی

چوڑی فہرست ہوتی ہے۔ حیدرآبادی مسلمان شادی کے نکاح کے لئے سب سے پہلے قرآن شریف جانماز اور کتبہ خریدتے ہیں۔ اس کے بعد جہیز کی دوسری چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ دعوت نامہ چھپنے سے قبل مہمانوں کی فہرست بھی تیار کرلی جاتی ہے۔ قریبی رشتہ دار شادی کی تیاری میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

شادی کی ابتدائی رسوم کی پابندی ہوتی ہے۔ ماں باپ چاہے امیر ہوں یا غریب شادی کے انتظامات اور رقم کی فراہمی کے لئے فکرمند ہوجاتے ہیں تاکہ ان کے آرزو ارمان پورے ہوں۔ والدین اگر خوش حال ہوں تو ٹھیک ورنہ سودی قرض لیا جاتا ہے جائداد کو بیچا یا رہن کیا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دور اندیش لوگ ایسے بھی تھے جو برس دو برس بلکہ آٹھ آٹھ برس دس برس شادی کو ملتوی کرتے ہیں کہ "کرینگے تو بڑے ٹھاٹ سے ہی کریں گے ابھی ایسی کیا جلدی ہے بہت سے واقعات ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ ان ہی خیالات کے ساتھ ماں باپ دنیا سے چل بسے اور اپنی آرزو ساتھ ہی لے گئے

بعض خاندان ایسے بھی ہیں جو باوجود دولت مند ہونے کے سادگی پسند کرتے ہیں جس طرح اسلام میں سادگی کے احکام ہیں۔ اسی طرح کے احکام شاستر کے بھی ہیں۔ ہندو گھرانوں میں تکلفات اور رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے مشکلات درپیش ہوتے ہیں۔

جس طرح ہندو گھرانوں میں جب کوئی پیام یا نسبت آئے تو زائچہ نکالا جاتا ہے کنڈلی ملائی جاتی ہے منحوس گھڑی اور ساعت سے بچا جاتا ہے۔ اسی طرح نجومی، جوتشی اور رمال کے ہاں مسلمان ماں باپ بھی رجوع ہوتے ہیں

بی بی کی صحنک: اس رسم کو گھر کی ہوی نہایت عقیدت سے انجام دیتی ہے۔ اس رسم میں نیاز کا کھانا کوری کوری صحنکوں میں دہی اور کھڑی دال ڈالکر جمایا جاتا ہے اور اس پر بی بی خاتون جنت کے نام سے فاتحہ دلائی جاتی ہے۔ دعوتی عورتیں اس کھانے کو یاد شوہر نوابے پر بسم کہتے ہوئے کھاتی ہیں اور پھر شادی کے گھر کی دیواروں پر صندل کے چھاپے لگا دیتی ہیں۔
تاریخ سے اس رسم کا پتہ یوں چلتا ہے کہ جہانگیر کی چھتی بیوی جودھا بائی راجپوت خاتون تھی۔ اُسے نورجہاں کے ساتھ موافقت نہ تھی۔ جہانگیر نے نورجہاں کو شیر افگن کی بیری تھی اپنے پاس لا رکھا تھا اور وہ جہانگیر کی نور نظر تھی جودھا بائی کے ساتھ سوتن کا سا برتاؤ کرتی تھی اور اس سے بہت جلتی تھی۔ ہر وقت نورجہاں اُسے دہقان زادی کہہ کر چھیڑا کرتی اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ جودھا بائی نے ایک منصوبہ باندھا اور ایک دن حضرت بی بی فاتون جنت بی بی فاتون جنت کے نام سے فاتحہ دلوانا تجویز کیا۔ کوری صحنکوں میں فاتحہ کا کھانا چنا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ تمام بیگمات جو اپنے شوہر پر قائم ہیں اس متبرک فاتحہ کا کھانا کھا سکتی ہیں اس دعوت میں نورجہاں بیگم شریک نہ ہوسکیں۔ اس لئے کہ ان کی شرکت ممنوع تھی۔ اس دن سے نورجہاں نے جودھا بائی کا نام لینا چھوڑ دیا۔ اسی وقت سے یہ رسم جاری ہوئی۔ بی بی کی صحنک کی رسم دولھا اور دولھن دونوں کے گھر پر لازمی ہے ملکہ جودھا بائی اسلامی عقیدت کے لحاظ سے اس رسم کی موجد ہیں۔ مذہب ہنود میں دیوی برہمن اور دیو کی اپنل کی

رسم ہوتی ہے برہمنوں اور سہاگنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اسی طرح دیوی کے نام سے انبل تیار کرکے پلاتے ہیں۔ اس رسم کا پتہ دھرماسادھو سے ملتا ہے ہندوؤں کے پاس دیو برہمن کی رسم لازمی ہے۔

رت جگہ کی رسم میں عورتیں رات بھر جاگتی ہیں گلگلے ملیدہ اور آسان اللہ کے نام سے بنایا جاتا ہے۔ رت جگہ کا پتہ ہندو شماستر سے نہیں چلتا

مانجھے (مایوں) کی رسم : منجا ہندی لفظ ہے۔ دولھا اور دولھن کو اپنے اپنے گھر مانجھے بیٹھاتے ہیں۔ رات بھر جاگتے۔ کے بعد دوسرے دن انھیں زرد (زعفرانی) رنگ کے کپڑے پہناتے جاتے ہیں۔ مانجھوں میں گھر کا فرش، دولھن رودلھے کے پلنگ کا بستر، مچھردان، تکئے وغیرہ بھی زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ مانجھے بٹھانے سے غرض یہ ہے کہ دولھا اور دولھن خانگی کاروبار سے فارغ ہوجائیں اور وہ تقریب شادی کے پابند ہوجائیں۔ مانجھے بٹھانے کے بعد دولھا بھی گھر سے باہر نہیں جاسکتا۔ دولھن کو کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا مانجھے کی رات دولھا دولھن کے ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے جاتے ہیں۔ خواجہ خضر کے جہاز چھوڑائے جاتے ہیں یہ جہاز بدوں سے بنائے جاتے ہیں۔ ان جہازوں کو کاج کے گھر میں رکھ کر غرمانے قصائد گاتے ہیں ان جہازوں پر میوہ لٹکایا جاتا ہے۔ پنی سے سجا یہ اس پر پھول کی لڑیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔ قصائد اور بردہ شریف پڑھنے کے بعد غرباء ان جہازوں میں سلامتی کے گھی آٹے کے چراغ جلاتے ہیں یہ لوگ کھانا کھا کر انعام لیکر دولھا یا دولھن کے سر پر یہ جہاز دیکر گھر ہی

ہی میں تھوڑی دور تک لے جاتے ہیں اور پھر ان جہازوں کو باہر لے جا کر کسی ندی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہلدی کی رسم مسلمانوں نے ہندوؤں سے لی ہے۔ ہندوؤں میں اس رسم کو اونٹی ہلدا کہتے ہیں اونشٹی مرہٹی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب بچی ہوئی ہلدی ہے۔ ایسے دولھے کے گھر بھیجا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں مانوں کی یہ رسم گیارہ دن تک ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں رشتہ دار نیو کے پیو کے کرتے۔ رات رات بھر گیت گائے جاتے خاندان کے تمام خواتیں زرد رنگ کے کپڑے پہن کر شریک تقریب ہوتے۔ ہلدی چکسہ ایک دوسرے کو لگاتے۔ مذاق دلگی ہوتی۔ روزآنہ کہیں نہ کہیں سے مانجھے سے مانجھے کا رسم آتا۔ دعوت کے دستر خوان چنے جاتے۔ ڈیوڑھی یا گھر پر نوبت بجتی رہتی۔ یہ سلسلہ ساچق تک جاری رہتا۔ گھر میں شادی کے جہیز کا سامان آتا رہتا۔ تیاریاں جاری رہتی۔

ساچق: مانجھوں کے بعد ساچق کی رسم کی جاتی ہے۔ اس روز دولھن اور دولھے کا گھر سجایا جاتا ہے۔ گھر پر روشنی کی جاتی ہے جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں منڈپ باندھتے ہیں دولھن کی بہن سمدھنوں کا استعمال صندل ہاتھ دیکر کرتی ہیں مصری بنائی جاتی ہے جسے میں ساچق کے بنے سنورے مہمان آنے لگتے مراثنیاں گانا شروع کر دیتی ہیں اور باہر رسم آتے ہی نوبت بھی بجنے لگتی ہے۔ اس رسم کو بعض خاندان بری کی رسم اور بعض لوگ تیل چڑھانے کی رسم یا بعض لوگ مسی بھیٹی کی رسم بھی کہتے ہیں۔ دولھا کے گھر سے آئے ہوئی رسم کی کشتیوں میں دولھن کے لئے بھاری کپڑوں کے جوڑے جس کی تعداد پانچ سے گیارہ تک ہوتی

جلوے کے لئے سرخ یا زرین چوحاشیہ۔ عروس کا پورا جوڑا جس میں گھونگٹ جس میں گود باندھا رہتا۔ چوڑی کے جوڑے، زیور، سنگھار کا سارا سامان مٹھائی کی بھی ٹوکریاں، بری کا سامان، جیسے بادام، کھجور۔ کھوپرے کی ثابت بٹیاں، مصری کی ہانڈیاں، چاندی کی سپاری میاں کے ٹوکرے پھول وغیرہ آتے ہیں۔ لفظ ساچق ترکی زبان میں حنا بندی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ شب گشب سے دو دن پہلے اس رسم کو بارات کی دھوم دھام کے ساتھ دولھن کے گھر لایا جاتا ہے دولھن کا رسم کرنے کے بعد سمدھنوں کو شربت پلاتے ہیں یا مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ رسم ترکوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی بارات، ساچق کی دھوم دھام اور پر تکلف جلوس بھی ترکوں کی ایجاد ہے۔

مہندی: مسلمانوں میں ساچق کے دوسرے دن مہندی کی رسم ہوتی ہے دولھن کے قرابت دار عورتیں جن میں کنواری سمدھن اور سہیلیاں دولھے کے گھر مہندی کا رسم لے جاتے ہیں جس میں دولھا کے نکاح میں پہننے کا جوڑا، جوتے چاندی کے کٹورے اور صابن دانی آئینہ برش اور حمام کا سامان اور رسم کی کشتی جس میں گنگا، تیل سرمے دانی، ڈاڑھی بنانے کا سامان عطر رسم کی چوکی وغیرہ ہوتا ہے مسلمانوں میں یہ رسم بڑی دلچسپی سے کی جاتی ہے۔ دولھن کی بہن سالی نہیں ہے ان کے ساتھ مرائیاں بھی جاتی ہیں۔

رسم کے لئے چوکی منڈپ کے نیچے رکھی جاتی ہے جس پر دولھا بیٹھتا ہے رسم کرنے والی سالی اور اس کے درمیان ایک سرخ کپڑا پکڑتے ہیں۔ چھوٹی سالی

دولھے کو ہاتھ کو مہندی لگا کر خوبصورت تاش یا کارچوبی کام کا مہندی بند باندھتی ہے اور انگوٹھی پہنائی ہے۔ اسی وقت وہ دولھا کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑی جب تک کہ ایک معقول رقم اسے نہ دی جائے۔ آجکل اس قسم کی اس میں متروک ہوگئی ہیں۔

ہندو شاستر کے خاطر سے شب گشت کے ایک روز پہلے دولھن کے قریبی رشتہ دار دولھا کے گھر آتے ہیں اور شب گشت کا انتظام ان کے فرائض میں داخل ہے۔

شب گشت:۔ یہ رسم ہندوں میں رائج ہے جسکو دریا چارن کہتے ہیں۔ یہ زبان سنسکرت کے الفاظ ہیں۔ یہ وہ رسم ہے جس میں دولھن کی جانب سے دولھا طلب کیا جاتا ہے پچھلے زمانے میں ایک تہائی رات سے پہلے شب گشت کی بارات نکلتی تھی جس میں روشنی کا سامان تشکلوں اور قندیلوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ دولھا کے عزیز و اقارب اور اہل قوم کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ہوتے۔ ہندوں اور مسلمانوں کے دولھے کی تقریباً وہی کیفیت ہوتی۔ نوشہ گلابی یا سرخ قمیص چوڑی دار پاجامہ مسلمانوں میں اور ہندوں میں سفید دھوتی مشجر، ہمرو یا ٹوسڈ کی شیروانی۔ دستار، پھر ترکی یا رومی ٹوپی میں ہوتا ہندو دولھوں کو شملہ باندھا جاتا۔ دولھا سجے سجائے گھوڑے پر جسکے آزو بازو چنور ..ا تھذئے لوگ ہوتے۔ ہندو دولھا سیدھا دولھن کے گھر پہنچتا۔ حیدر آبادی مسلمانوں میں یہ دولھا نماز شکرانہ دو رکعت کسی مسجد میں ادا کر لیتا ہے اور یہ بارات میں پہلے بیانڈ باجے ہوتے ان کے بعد عروب ٹمکیاں بجاتے اور گاتے۔ دولھے اور بارا تیوں سے انعامات کہتے چلتے۔ پرانے زمانے میں دولھا کے ساتھ

شادی کی بارات

وقت رواں ہوتا۔ طائفے ساتھ ہوتے اور اکثر بنڈی میں نوبت روشن چوکی
کے ساتھ ہوتی۔ یہ بارات صبح صادق تک دولھن کے گھر پہنچ جاتی جہاں استقبال
کے لیئے دولھن کی برادری گھر کے دروازے کے باہر موجود رہتی۔ دولھن کے گھر
کا دروازہ اس وقت تک نہیں کھولا جاتا۔ جب تک کہ دولھن کے بھائی
یا اس کے قائم مقام ایک خاص رقم دولھا سے دھنگانہ کے طور پر نہ اصول کرلیں
اس لفظ کا صحیح املا دھنیانہ ہے۔ یہ ایک قسم کا جرمانہ ہے جو نوشہ نے غیر معمولی
وقت پر عروس کے گھر پر چڑھائی کی لہذا دولھن کے چھوٹے بھائی کو یہ حق
پہنچتا ہے کہ وہ دھنگانہ کی رقم اصول کرتے دروازہ کھولے۔ ہندؤں میں بھی
دھنگانہ کا رواج ہے جس کو سنسکرت میں مدھومرگ کہتے ہیں مرہٹی ہی میں
بھنٹ بکرا کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا انعام سمجھا جاتا ہے جو دولھا کی ماں دولھن
کی والدہ کو دیتی ہے۔ جب کے دولھے کی والدہ عقد کے بعد بہو کو لے جانے کے
لئے دولھن کے گھر آتی ہے۔

دھنگانہ کی رقم ادا کرکے دولھا کو مسند پر لے جانے سے پہلے ایک پردے
کے پیچھے سے دولھن کے ہاتھ سے دولھا پر اور دولھا کے ہاتھ سے دولھن پر
چاول پھول اور مصری نچھاور کرتے ہیں جس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ یہ دونوں
ازدواجی زندگی میں پھولیں۔ ہندؤں میں شادی کا منڈوا کھجور کے تیوں
سے بنایا جاتا ہے اور اس کے بیچ دولھا دولھن کو بٹھایا جاتا ہے۔ پنڈت
لگن کی تیاری کرتا ہے۔

مسلمانوں میں دولھے کو جہاں نکاح کے لئے بٹھایا جاتا ہے

سہرے کا رواج: سہرا موتیوں یا مقیش کے تاروں یا صرف پھول کی لڑیوں سے بنایا جاتا ہے جو بطور نقاب دولہا کے سر پر باندھا جاتا ہے مسلمانوں میں سہرے کا رواج عرب اور عجم میں کہیں نہیں۔ ہندوؤں میں سہرے کا رواج احکام شاستر کی رو سے قائم ہوا۔ جسکو بھال سنگ کہتے ہیں۔ شادی کی تقریب میں شاستری احکام کے لحاظ سے دولہا اور دولھن کے لئے بھال سنگ کا ہونا فرض ہے جس سے دونوں کے چہرے خاص وعام کی نظروں سے کسی قدر الگ دکھائی دیں۔ ہندو شاستر میں دولہا اور دولھن دونوں معمولی انسان نہیں سمجھے جاتے بلکہ قدرت الہٰی کے مظہر مانے جاتے ہیں۔ دولھن کو لکشمی کہتے ہیں اور دولھے کو پرمیشور یہ خیال اس بنیاد پر ہے کہ مخلوق کی پیدائش انھیں دونوں کی وصیعت کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں میں جسطرح نکاح ضروری ہے اسی طرح ہندوؤں میں سپتا پدی کی رسم ضروری ہے کہ دولہا دولھن کو منگل سوتر باندھکر سات پھیرے مقدس آگ "دواہوما" کے اطراف لیتا ہے۔

پھول مصری اور چاول کے نچھاور کرنے کی رسم کے بعد دولہا مسند پر جا بیٹھتا ہے قاضی صاحب ایجاب و قبول کے بعد دعا پڑھتے ہیں نکاح کی دعا پڑھی جانے کے بعد بادام کھجور مصری لٹائی جاتی ہے۔ شعرا حضرات سہرا پڑھتے ہیں۔ حیدرآبادی شادیوں میں جو سہرے لکھے جاتے ہیں۔ وہ وصیتوں کی طرح کے ہوتے خوبصورت کریپ کاغذ پر لکھے ہوتے ہیں۔ طوائف یا قوال مبارک باد دیتے۔

صبح کے نکاح میں دعوتیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ پہلے خاص خاص

شادی کی رسم میں مقدس ہون کے دلہا دلہن پھیرے لیتے ہوئے۔

مہمان دستر خوان پر بٹھائے جاتے دولہا کو خصوص دستر خوان پر بٹھایا جاتا
اس دعوت میں بریانی، روٹی سالنوں، میٹھوں یعنی پورے لوازمے پر ورق لگایا
جاتا ہے۔

حیدرآباد میں جس وقت سے راشننگ کارڈ کا سسٹم شروع ہوا تو شادی
شام کی ہونے لگی چوتھی اور ولیمہ میں بڑی دعوتیں دی جانے لگیں۔ شادی میں
میں عصرانہ دیا جاتا ہے۔

نکاح کے ساتھ ہی دولھن کو کالی پوتھ کا کھا اور نتھ پہنائی جاتی ہے۔
سدی اس کی کنگھی چوٹی کرکے کنگ لیتی ہیں۔ حال حال سے یہ رواج بھی کم
ہوتا جارہا ہے۔ مسلمانوں میں دولھن شرم کے مارے اپنی آنکھیں بند رکھتی
ہے گھونگھٹ اوڑھنی جھکی ہوئی بیٹھی ہے دولھن کے سنگھار کرنے کے بعد
جلوہ کی رسم کی جاتی ہے : جلوہ زبان عربی کا لفظ ہے جو دیدار اور نظارہ
کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جلوہ رات میں ہوتا ہے۔ دولھا اور دولھن آمنے
سامنے بٹھا کر آئینہ میں ان رونمائی کی جاتی ہے۔ قرآن شریف دونوں کو
دکھائی جاتی ہے۔ دولھا دولھن کی صورت دیکھنے کے بعد جو انگوٹھی اس کو پہناتا
ہے عارسی مصحف کی رسم کہتے ہیں جلوہ کی رسم کے بعد رخصتی سے قبل جب دولھن
کا باپ دولھے کے ہاتھ میں دولھن کا ہاتھ دے کر اپنی لاڈلی بیٹی کو اسکے
حوالے کردیتا ہے اور وعدہ لیتا ہے کہ وہ اپنی رفیقِ حیات کو خوش و خرم
رکھے گا۔ اسی طرح سمدھی سمدھنیں بھی ہاتھ ملا کر ان بھلائی اور راحت کا
کا خیال رکھنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس وقت دولہن بہت روتی ہے۔

اپنے ماں باپ بھائی، بہنوں کو چھوڑنے کا غم ساتھ لیکر دولھن ایک نیا گھر بسانے جارہی ہے۔ پہلے زمانے میں دولھا دولھن کو گود میں اٹھا کر ڈولی یا پھولوں سے سجی ہوئی موٹر میں سوار کرتا۔ کہ زندگی بھر وہ اس کا سارا بوجھ سنبھالے گا۔

باز گشت: بھی تقریب بارات کی سی ہوتی ہے۔ دولھے کی بارات اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ سواری کی دونوں جانب دو جنور بردار مورچل جھیلتے رہتے ہیں اس سے یہ مقصد بارات کی شان وشوکت میں اضافہ کا ہوتا ہے دوسرا مقصد نوشہ اور عروس کی حفاظت بھی ہے۔

دولھے کے آگے آتش بازی چھوڑتے ہوئے لوگ ان کے ساتھ چاؤش ٹملی دف اور ڈھولک کی آوازوں کے ساتھ ناچتے کودتے چلتے ہیں دولھے کی سواری کے پیچھے بارات کی سواریاں ہوتیں اور جہیز کا سامان مزدور لئے پیچھے پیچھے چلتے۔

دولھا دولھن کی یہ بارات بڑی شان وشوکت کے ساتھ مختلف راستوں سے گذر کر دولھا کے گھر پہنچ جاتی۔ دولھے کے گھر پہنچتے ہی بکرا یا مرغ صدقہ کے طور پر خیرات کردیتے ہیں۔ دولھن کے ساتھ جو ساتھ کا برتن یعنی لوازمے سے کھانا وغیرہ بھیجا جاتا ہے سب ملکر کھاتے ہیں۔ دولھن کو کھیر کھلائی جاتی ہے۔ دولھن کو کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

چوتھی: دوسرے دن دولھن کے چھوٹے بھائی، بہن سالا، سالی کھیر کھچڑی لاتے ہیں ان کے ساتھ ہی دولھن میکے چلی جاتی ہے رات میں مختصر سی دعوت کے بعد

چوتھی کھیلی اور ترکاری سے کھیلی جاتی ہے اس تقریب میں ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ سالا دولھے کا جوتا چوری کرتا ہے رقم یا مٹھائی لے کر واپس کرتا ہے۔

ولیمہ: ولیمہ کی دعوت دولھے کی طرف سے دی جاتی ہے جو سنت رسول کی تکمیل ہے۔ ہندؤں میں یہی تقریب ست نارائن کی کھتا کروا کر دولھن والوں کی دعوت کی جاتی ہے۔

جمعگی: شادی کے بعد جو جمعہ آتا ہے اس دن یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ کل پانچ جمعگیاں ہوتی ہیں۔ گنے چنے مہمانوں کو مدعو کیا جاتا ہے، اس موقعہ ضیافت کے بعد دولھا دولھن کی گلپوشی کی جاتی ہے۔

ہاتھ برتائے کی رسم: یہ شادی کی آخری رسم ہے اسی کو سمدھ ملاوہ بھی کہتے ہیں۔ یہ تقریب دولھے کے گھر پر رچائی جاتی ہے۔ اس تقریب میں دولھا کے گھر پر یہ رسم کی جاتی ہے دولھن کے والدین معہ اپنے خاندان کے ساتھ لے جاتے ہیں اور دولھن کو بھی خانہ داری کے کاروبار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور سامان خانہ داری کا برتاؤ سکھاتے ہیں۔ اس دن دلھن اپنا گھونگھٹ اتار دیتی ہے۔ اسی دن سمدھ ملاؤ کی رسم کی جاتی ہے جہاں سمدھیوں اور سمدھنیوں کی ملاقات کی تقریب کیجاتی ہے۔ ہر ایک جمعہ کو بھی دولھے کے گھر یا دلھن کے مکان پر ان کے والدین کی بھی مہمانی رہتی ہے اس کو جمعگی کہتے ہیں۔

بیوہ کے عقد ثانی: بیوہ کے عقد ثانی کا رواج پہلے ہندؤں میں نہ تھا لیکن آہستہ آہستہ قوم ہندو نے بھی بیوہ کی

تآن پر بھی توجہ دینی شروع کی ہے۔ پرانے زمانے میں اہل اسلام اور قوم ہندو
دونوں میں عقد ثانی کا رواج تھا ہی نہیں مسلمانوں کے علمائا اور ہندوؤں کے
اکثر بعلوں نے اس کی ترمیم کے متعلقات تصانیف اور قانون بنائے ہیں۔
اور کئی ایک میں لئے گئے سہرہ الرے اس سلسلے میں بہت کوشاں تھے انھوں نے
شوہر کے وفات کے بعد بیوہ کی ستی پر اصرار کرنے والوں کو حکم دے دیا تھا کہ
عورت کے مرنے کے بعد بھی اسکو شوہر کو ستی ہو جانا چاہیئے اور برح حقیقہ بیوہ
کو عقد ثانی سے اقرار کرنا چاہیئے اکبر کے اسی اصول سے ستی کی اس خطرناک رواج
کو مٹایا اور اسی نے قوم ہنود کے کئی افراد کو باوجود اختلاف احکام شاشتر
عقد ثانی کی طرف متوجہ کیا تھا۔

پردہ کا رواج

پرانے زمانے میں مسلمان عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ پرانے ہندو خاندان کی عورتیں خصوصاً کایستھ اور راجپوت عورتیں پردہ کی بڑی پابند تھیں۔ البتہ نیچے طبقہ کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اور جہاں پردہ کا رواج نہ تھا وہ عورتیں بھی شاید و نادر ہی کسی مجمع میں آتیں جو عورتیں پردہ کی پابند نہ تھیں ان پر انگشت نمائی کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو مدرسہ لانے اور لے جانے کے لئے موٹروں کے چلن سے پہلے شکراموں اور بنڈیوں کا مدرسہ کی جانب سے انتظام کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد ہی یہ بھی برخاست کر دیا گیا۔ آج کل پردہ کا وہ رواج نہیں رہا جو پہلے تھا۔ آجکل عورتیں یہاں مردوں کے دوش بدوش کام کے لئے باہر جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اکثر مسلمان عورتیں برقعہ پہن کر باہر جاتا کرتی ہیں۔

رسوم میت

مسلمانوں میں رسوم میت۔

جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا ہے تو اسکی صحت کے واسطے بہت سے
جتن کئے جاتے ہیں۔ عزیز و اقارب عیادت کے لئے آتے ہیں مریض کا صدقہ دیا
جاتا ہے۔ علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اگر مریض صحت یاب ہو جائے
تو اس کو غسل صحت کرایا جاتا ہے۔ گلپوشی کی جاتی ہے۔ لیکن جب اس کے آرام
اور صحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ روز بروز کمزور اور لاغر ہوتا جاتا
ہے یہاں تک کہ ڈاکٹر اور حکیم نا اُمید ہو جاتے ہیں اور مریض قریب مرگ ہو جاتا
ہے تو لوگ اس کی صحت کی بجائے اس کی جان کنی کی مشکل آسان ہو جانے
کی دعائیں کرتے ہیں اس کا دھیان خدا کی طرف راغب کرنے کی غرض سے آہستہ
آہستہ کلمہ شہادت پڑھتے اور سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرنے
والے کو بری طرح پیاس لگتی ہے اس لئے اسے پانی چواتے ہیں۔ جب روح پرواز
ہو جاتی ہے تو قریبی رشتے دار اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرکے دونوں پیروں
کے انگوٹھے ملا کے ڈوری سے باندھ دیتے ہیں، سرہانے کا تکیہ ہٹا کے سر پر عصابہ
باندھتے ہیں اور ایک سفید چادر سر سے پاؤں تک اڑھا دیتے ہیں اور بخورات
سرہانے جلائے جاتے ہیں۔ کسی حافظ کو بٹھا کر کلام اللہ کی تلاوت کراتے ہیں۔

عورتیں اس موقع پر بین کرتی رہتی ہیں اور مرد تجہیز و تکفین کی تیاری میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آخر کار میت کا غسل کرایا جاتا ہے۔ پھر میت ڈولے میں رکھ دی جاتی ہے اور ڈولا اٹھانے والے پہلے ڈولے کو تین مرتبہ زمین سے مس کرتے ہیں اور پھر اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے کسی مسجد تک لے جاتے ہیں اور وہاں ڈولا رکھ کر نماز جنازہ با جماعت ادا کرتے ہیں۔ نماز کے بعد پھر ڈولا اٹھا کے اس طرح کلمہ پڑھتے ہوئے قبرستان تک لے جاتے ہیں۔ میت کو قبر میں لٹا کے سرہانے اور پائنتی کے کفن کی گرہ کھول دیتے ہیں۔ اور میت کا منہ قبلہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اور سلیں رکھ کر مٹی سے قبر کو پاٹ دیا جاتا ہے پھر پانی چھڑک کر قبر پر پھول ڈالتے اور فاتحہ خوانی کرنے واپس ہوتے ہیں۔ چونکہ میت کے گھر میں اس دن چولھا نہیں جلتا۔ اس لئے قریب ترین رشتہ دار حاضری لے جاتے ہیں تاکہ مرحوم کے غمزدہ متعلقین اپنا حلق بھگوئیں۔ میت کے گھر سے جانے کے بعد گھر کی صفائی کی جاتی ہے۔ اور جن لوگوں نے میت کو مس کیا وہ غسل میں میت کرتے ہیں۔

اس کے تیسرے دن فاتحہ سوم یا تیجا کیا جاتا ہے جو برادران ہنود کی رسم ہے اکثر ہندو حضرات اپنے مردے کو دفن نہیں کرتے بلکہ شمشان گھاٹ میں جلا کر اس کی راکھ کو تیسرے دن کسی ندی میں بہا دیتے ہیں اور کچھ غذائیں میت کے نام نذر کر کے شمشان گھاٹ میں رکھ دیتے ہیں۔

اگلے زمانے میں شہر حیدر آباد کے اطراف فصیل بنی ہوئی تھی اور بارہ دروازے اور تیرہ کھڑکیاں بنائی گئی تھیں غالباً یہ کھڑکیاں اس لئے بنائی گئی تھیں کہ

کہ شہر کے بارہ دروازے رات میں آٹھ بجے سے صبح تک بند رہتے تھے۔ اگر
کوئی جنازہ فصیل کے باہر لے جانا ہو تو متعلقہ کھڑکی سے لے جایا جاتا۔
جنازوں کی برآمدگی انھیں کھڑکیوں سے ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ شہر
پناہ کے دروازوں سے بادشاہ کی سواری گزرتی تھی۔ اس لئے ان میں سے
میت کالے جانا منحوس سمجھا جاتا تھا۔ فصیل کی کھڑکیاں یہ تھیں۔ چمپا دروازے
اور دلی دروازے کے درمیان چار محل کی کھڑکی دلی دروازے اور چادر گھاٹ
کے دروازے کے درمیان ہاتھی کی کھڑکی۔ چادر گھاٹ اور دروازہ دبیر پورہ
کے درمیان بودعلی شاہ کی کھڑکی دبیر پورہ اور یاقوت پورہ کے درمیان ماتا
کی کھڑکی۔ یاقوت پورہ اور تالاب میر جملہ کے درمیان رنگ علی شاہ کی کھڑکی
تالاب میر جملہ اور گولی پورہ کے درمیان کوت کمندان کی کھڑکی۔ علی آباد اور
فتح دروازے کے درمیان غازی بنڈہ کی کھڑکی فتح دروازے اور پرانے پل
کے درمیان ملبو ہرنوں کی کھڑکی۔ اب نہ یہ کھڑکیاں رہیں اور نہ تمام دروازے
البتہ دبیر پورہ اور پرانے پل کے دروازے رہ گئے ہیں۔

تیجے کے بعد دسویں بیسویں اور چالیسویں دن، تلاوت قرآن اور
فاتحہ خوانی سے مرنے والے کا ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔

ہندو حضرات کے گھروں میں موت واقع ہونے پر مرنے والے کی آخری
رسومات انجام دینے والے کا سر منڈا دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں چالیسویں
دن کے رسم کو چہلم کہتے ہیں جو بڑی دھوم سے منائی جاتی ہے۔ یہ رسم
پورے چالیس دن گزرنے پر نہیں ہوتی بلکہ دو ایک دن گھٹا دیتے جاتے

ہیں چہلم کے دن مرنے والے ایصال ثواب کے لئے کپڑوں کا جوڑا جانماز۔ اور تسبیح لوٹا اور کھانے کے برتن وغیرہ کسی مستحق غریب کو دے دیتے ہیں۔ اسی انداز سے ہندو حضرات مرنے کے تیرھویں دن میت کے آخری رسومات انجام دینے والے برہمن پنڈت کو لباس برتن اور جنیو وغیرہ دیتے ہیں۔ اور تیرہ برہمنوں کو کھانا مرنے والے کے نام پر کھلاتے اور رشتہ داروں کو بھی مدعو کرکے دعوت کر دیتے ہیں۔

ہندو اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ رسم برسی بھی ہے ہر سال مرنے والے کے نام سے کی جاتی ہے۔

حیدرآباد کا محرم

حیدرآباد میں قطب شاہوں نے غم حسینؓ کی عظمت کو بڑے حسن اور سلیقے سے انسانوں کے دلوں تک پہنچایا۔ ہندوستان میں وہ ایک ہی مقامات ایسے ہیں جہاں محرم شاندار طریقے سے منایا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ محرم منانے والوں میں اہل لکھنؤ مشہور ہیں۔ لیکن اب محرم کی جگہ حیدرآباد دکن نے لے لی ہے یہاں آج بھی ہر سال منظم طریقے سے محرم منایا جا رہا ہے۔ تلنگانہ کے ہندو محرم کو پیر پنڈوگا۔ یعنی پیروں کا تہوار کہتے ہیں حیدرآباد کا محرم تو جی یکجہتی کا مثالی نمونہ پیش کرتا ہے۔ حیدرآباد میں یہ رواج زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ہر ماہ نیا چاند دیکھکر لوگ آپس میں آداب سلام کرتے ہیں لیکن محرم کا چاند دیکھ کر سلام نہیں کرتے کیونکہ محرم اہل بیت کے مصائب اور آلام کا زمانہ ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت ۱۰ محرم کو ہوئی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام ان کے عزیز و اقارب اور ان کے انصار کربلا کے صحرا میں ابن زیاد کے حکم سے شہید کردیئے گئے۔ اسی لئے محرم میں مرثیئے پڑھے جاتے ہیں، ور مجالس ماتم منعقد کی جاتی ہیں۔ جگہ جگہ تربت اور پانی کی سبیلیں لگائی جاتی ہیں کیونکہ کربلا کے شہدا بھوکے پیاسے شہید ہوئے تھے۔ مسکینوں کو ان کے نام سے کھانا کھلایا جاتا ہے

فیقری کرتے ہیں۔ اس مہینے کا احترام ہمارے دلوں میں ایسا جاگزیں ہوگیا ہے کہ سرخ رنگ کے بھڑک دار کپڑے پہننے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ سبز یا سیاہ رنگ کا لباس بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ شیعہ حضرات کے گھروں پر روزآنہ مجلس ماتم منعقد ہوتا ہے اور امام کے نام کے علم استاد کئے جاتے ہیں۔

قطب شاہیوں کے عہد کی بہت سی پرانی روایات کے ساتھ ساتھ حیدرآباد آباد میں نظام علی خاں کے زمانے میں ایرانیوں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ ارسطو جاہ اور ان کے بعد ایرانی وزیروں کا ایک پورا سلسلہ سالار جنگ اور ان کی اولاد تک چلتا ہے۔ جن کے اثر سے حیدرآباد میں محرم کی کچھ مخصوص روایات نشونما پائی تھیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے سارے طبقوں اور فرقوں کے لوگ محرم کو خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ عجیب طور پر مناتے ہیں۔

زمانے سے حیدرآباد میں ایک رواج چلا آرہا ہے کہ محرم کی چاند رات سے پہلے ہی دولھن اپنے میکے بلائی جاتی تھی۔ اور شہدائے کربلا کی زیارت تک دولھا اس کی صورت نہیں بتائی جاتی تھی۔ اب بھی نئے دولھا دولھن کے لئے طرفین ایک دوسرے کو فیقری کے کپڑے، جھولی، آئینیاں وغیرہ بھیجتے ہیں۔ کھچڑی اور دو قسم کے شربت سے تواضع کی جاتی ہے محرم اور صفر کی مختلف تاریخوں میں محرم کا خاص پکوان نقل، روٹ چونگے بتی، قبولی، کھچڑی، شربت وغیرہ تیار کرتے بعد فاتحہ خوانی مہمانوں کو کھلایا جاتا ہے۔ الاوَن میں عقیدت مند لوگ علموں پر پھول، گود، ڈھنی سہرا چڑھاتے اور کچھ پیسے روپئے غلے صندوقں میں ڈالتے ہیں۔

پانچ محرم سے شہر کی رونق اور دھوم دھام بہت بڑھ جاتی تھی۔ مہاراجہ چندولال، مہاراجہ کرشن پرشاد اور راجہ شیوراج کی دیوڑھیوں پر روشنی کرائی جاتی تھی۔ راجہ شیوراج کی دیوڑھی پر لب سڑک بالائی منزل پر مختلف وضع کے پتلے بٹھائے جاتے تھے۔ اور روشنی کی جاتی تھی۔ وہاں پر چند مسخرے جمع ہو جاتے جو رات بھر آنے جانے والے نمائش بینوں کو ہنساتے رہتے۔ پیشکار کی دیوڑھی میں روشنی کی ٹٹیاں ہوتیں۔ ہزاروں چراغوں سے میدان جگمگا تا رہتا

مہاراجہ چندولال نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں لکھا ہے

"یہ نیاز گزشتش بھی عقیدت سے۔
آبدار خانہ اور ٹٹی میں قسم قسم کی روشنی کرتا اور اشجار اور بلوری قنادیل اور چالیس زجاجی چراغ زنگار رنگ کے آویزاں کرتا ہے کہ دیکھنے والا اور سننے والا حیرت سے دیکھتا اور سنتا ہے۔"

دولت اور ارزانی کی وجہ سے حیدرآبادی لوگ سکون اور آرام کی زندگی گذارتے تھے۔ محرم کا تماشا دیکھنے کے لئے شوقین لوگ بنگلوں اور دیوڑھیوں کے جھروکوں پر معہ احباب کے بیٹھ جاتے تھے اور خواتین چلیونوں کے پیچھے بیٹھ جایا کرتیں۔

پنج محلہ شاہی محل بھی پانچ محرم سے کھلا رہتا تھا اس شاہی محل کی وسعت مکہ مسجد سے شاہ علی بنڈہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہیں اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی بادشاہ کی مشہور سخاوت سے غریبوں کی جھولیاں بھر دی جاتیں تھیں ہزاروں لوگ ادھر ادھر پھرتے رہتے۔ ان درمیان کہیں کہیں کوڑے

والے نظر آتے تھے۔ سوانگ بھرنے والوں میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو دلچسپی لیتے تھے۔ کوڑے والا سرخ رنگ کے کپڑے پہنا، پاؤں میں گھنگرو باندھے ہاتھ میں ایک بڑا کوڑا اپنی پیٹھ پر مارتا اسکے ساتھ ایک عورت ہوتی جو ڈھولک پر لکڑی سے بجاتی اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتی۔ مثنوی شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ دھڑے کی تال پر چھلانگ لگاتے پھرتے۔ کوئی جوگی بنتا۔ کوئی لنگور کوئی جسم پر کالک لگاکر لنگوٹی کستا اور چور کا سوانگ بھرتا۔ اور اندر سبھا کے نام سے ایک جماعت مردانی اور زنانی خوبصورت لباس پہنے پاؤں میں گھنگرو باندھے طبلہ ہارمونیم اور سارنگی بجاتی گیس گاتی ادھر اُدھر پھرتی۔ رات رات بھر شہر میں چکریں لگاتی۔ سڑکوں پر بھی ہاتھی گھوڑے رتھ، شکرام اور جھٹکوں میں سوار لوگ شہر میں تماشا دیکھتے پھرتے

۵/ محرم کو ہی اعلیٰ حضرت کا لنگر نکلتا تھا۔ اس لنگر میں مملکت کی ساری فوج بے قاعدہ اور باقاعدہ اور پولیس کی جمعیت کے علاوہ صرف خاص اور پائیگاہ کی فوجیں اعلیٰ حضرت کے لنگر میں ہوتیں۔ میرے نانا حضرت بھی فوج بے قاعدہ کے موروثی کمندان تھے۔ سلطان شاہی میں کمندان دو کی دیوڑھی کمندان کی کوت اور کمندان کی کھڑکی مشہور رہے۔ کوت میں علم شور خانہ تھا۔ جہاں علم استیادہ کئے جاتے تھے۔ لنگر کے روز سارے شہر میں غیر معمولی چہل پہل رہتی۔ دن پہلے ہی سے کوٹھوں اور راستے کی گلیوں کے دروازوں ملونیں ڈال کر خواتیں بھی بیٹھ جاتیں۔ جہاں سے باہر کا تماشا نظر آتا تھا۔ شہر میں علم جہاں سے گزرتے میلے لگ جاتے تھے۔

لنگر کے روز ہر طبقے اور ہر ملت کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوتا۔ جو شاید ہی اور کسی موقع پر دکھائی دیں۔ گولی لوگ کوڑی والا عود پکارتے ہوئے پھرتے اس روز ہزاروں روپیوں کا عود بکتا ہے۔

لنگر میں سب سے پہلے نشان کا ہاتھی ہوتا۔ اس کے بعد کوتوال شہر کے سوار، پیدل، ستی افغان پولیس کی جمعیت جو بیانڈ اور مشکی باجوں کے ہوتی ہوئی گزرتی۔ اس کے بعد کوتوال شہر جنکے ہاتھ کے ساتھ ساتھ دو جلاد کتے لئے ہوئے چلتے اور اس کے بعد نظم جمعیت کی فوج کا سلسلہ شروع ہوتا مختلف فرقوں کے سپاہی، عرب، سندھی، راجپوت، راٹھور، سکھ، پربھیا روہیلے، اور حیدری پٹھان لال لال کوٹ پہنی ہوئی بے قاعدہ پلٹن اپنے اپنے سلسلہ سے باجوں کے ساتھ گزرتے انکے علاوہ وار بھی انکے اپنے حلقوں میں ہوتے۔ عماری میں کوئی سوار تو کوئی گھوڑے پر کوئی میانہ یا پالکی میں بیٹھا۔ سالار فوج کمنداں اید رجمعدار چاندی منڈی ہوتی گنگا جمنی عماری یا ہودج میں سوار رہتے۔ ہاتھی کو کاچوبی جھول اڑاں جاتی تھی انکے ساتھ ساتھ کوتل گھوڑے بھی ہوتے۔ مغلیہ دور کے اعزاز ماہی مراتب، چتر، علم سے سرفراز تھے وہ اس کے ساتھ ہوتے۔ غرض یہ جمعیت مغلیہ دور حکومت کی یادگار تھی۔

نظم جمعیت کے بعد فوج باقاعدہ کے دستے بڑھتے سپہ سالار بڑے بڑے اسٹاف کی جھرمٹ شاندار گھوڑوں پر سوار رعب جلالی سے آہستہ آہستہ چلتے اور دیر تک رجمنٹ لانسر اور ملٹری مارچ پاسٹ کے بعد

مرفخاص اور پھر پائیگاہ کی جمعیت باری باری سے آتی۔ لنگر کی کشتیاں کا کاماٹیں سر پر اٹھائی ہوئی چلتیں۔ ان کشتیوں میں ملیدہ، نذر کی اشرفیاں، لنگر کی طلائی زنجیر رکھی ہوتی۔ شربت کی تھلیاں۔ اور کھچڑی کے دیگ بھونی لئے چلتے رہتے۔ یہ لنگر حسینی علم کو جاتا تھا۔

۷/ محرم کو امام قاسم کی سواری اٹھائی جاتی ہے۔

فقیری: عموماً ۷/ محرم کو اکثر گھرانوں میں فقیری کی رسم اس طرح منائی جاتی کہ نقل کسی ہرے کپڑے میں اجالے (روپیہ اٹھنی، چونی وغیرہ) لال ناڑے سے باندھ دیتے ہیں اور پھر اس جھولی کو سرخ، سبز آنٹی میں باندھ کر امام حسینؑ کے نام سے فاتحہ دیکر وہ جھولی جس کی کے گلے میں ڈالتے ہیں وہ امام حسینؑ کا فقیر کہلاتا ہے۔ اسی طرح عورتیں عام طور سے فقری کے دن ہلکے یا گہرے سبز رنگ کے کپڑے جو گھروں میں یا رنگریز سے رنگوائے جاتے پہنتی ہیں۔ بعض گھرانوں میں بچوں کو ۸/ محرم کو سقا اس طرح بنایا جاتا تھا کہ وہ دودھ کے شربت پر فاتحہ دے کر سقا سب کو وہ شربت تقسیم کرتا تھا سقا بنانے کی وجہ تسمیہ یہ ہے میدان کربلا میں یکے بعد دیگرے امام حسینؑ کے عزیز واقارب شہید ہو چکے اور فوج حسینی کے علمدار حضرت عباس ابن علی نے امام سے جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ تم تو میری فوج کے علم دار ہو تمہیں رن کو جانے کی کیسے اجازت دوں۔ اس پر حضرت عباس نے کہا کہ مولا! اب وہ فوج ہی کہاں رہی جسکی میں علمداری کروں سب کے سب جام شہادت نوش کر چکے۔ یہ سن کر امام نے فرمایا کہ اچھا بھائی مشک لیتے جاؤ اور خدا سے سکینہ اور

اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے پانی نے آؤ" چنانچہ حضرت مشک لئے ہوئے فراد تک دشمنوں کا صفایہ کرتے ہوئے پہنچے اور مشک میں پانی بھر لیا۔ لیکن افسوس کہ اس مشک کو خیمۂ حسینی تک نہ لا سکے۔ کیونکہ دشمنوں نے نہ صرف تیر چلا کر مشک کا سارا پانی بہا دیا بلکہ پیچھے سے آکر آپ کے دونوں شانے قلم کر دیئے۔ اس طرح حضرت عباس سقائے حرم کہلائے۔

۱۰ر محرم کو بڑے اہتمام سے دن کے ۲ بجے کے بعد قطب شاہی زمانے کا بی بی کا علم جو آج تک بی بی کے الاوے میں زیر اہتمام محکمۂ امور مذہبی صرف خاص دس روز تک استادہ رہتا ہے مخصوص ہاتھی پر عماری کس کے ہزاروں ہندو مسلم افراد کے جلوس کے ساتھ شہر کے مختلف مقررہ مقامات پر گشت کر دیا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھائی اس موقع پر نذریں پیش کرتے ہیں۔ ماتم داروں کا جلوس شہزادہ علی اصغر کا جھولا لئے ہوئے علم کے پیچھے سینہ کوبی کرتا ہوا گزرتا ہے اس منظر کو ہر دیکھنے والا حسرت و یاس کی آنکھوں سے کچھ نہ کچھ آنسو بہائے بغیر نہیں رہتا۔

محبوب علی بادشاہ کے زمانے میں محرم کے جو سوانگ پیش کئے جاتے تھے۔ ان کو ایک تماشاہ سمجھ کر عثمان علی بادشاہ نے حکماً بند کروا دیا۔ اس کی جگہ ماتم سیاہ پوش سروپا برہنہ ماتم داروں نے اس کی جگہ لے لی۔

مجالس عزا : مجالس عزا کا اہتمام یکم محرم سے آٹھ ربیع الاول تک ہوتا ہے محرم کے عشرہ اول میں سات محرم کو حضرت امام قاسم کی مہندی کا علم اٹھایا جاتا ہے چنانچہ حیدرآباد میں عباس صاحب مرحوم اور فضل علی صاحب مرحوم کی مشہور اور معروف مجالسوں میں عقیدت مند حضرات بہ کثرت شریک ہوتے ہیں دن کے بارہ

فضل علی صاحب کی مجلس ہوتی ہے۔ اور علم اٹھایا جاتا ہے۔ اسی بکہ بعد ہی
عباس صاحب مرحوم کی مجلس میں لوگ جوق در جوق سیاہ لباس میں ملبوس
ہوکر جمع ہوتے اور شریک مجلس ہوکر علم کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔
مجلس کی ابتدا سوز وسلام اور مرثیے سے ہوتی ہے۔ مرثیہ خوانوں کی
کم از کم دو چوکیاں ہوتی ہیں ہر مرثیہ شہدائے کربلا کے حالات پر مشتمل ہوتا
ہے۔ مرثیہ خوانی کے بعد ذاکر منبر پر جا بیٹھتا ہے اور مختصر سا عربی خطبہ پڑھتا ہے جس میں
قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت کرکے اس کے معنی اور تفسیر مختصر بیان کرتا ہے۔
اور کسی اخلاقی موضوع پر بحث کرکے واقعۂ کربلا سے اپنے بیان کو مربوط کرتے
ہوئے کسی شہید کے حالات شہادت پر اپنا بیان ختم کرتا ہے۔ اس میں گھنٹہ
ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے اس کے بعد ماتم دار گروہ قائم کرتے ہوئے (سینے پر
ہاتھ مارتے ہوئے) یا حسینؑ یا حسینؑ کہتے اور یا عباس یا عباس کہہ فارسی
یا اُردو میں نوحہ پڑھتے ہیں جو غزل کی شکل کا ہوتا ہے۔
مثال کے طور پر: ؎
؎ دفن کرکے لاشۂ اکبر کو یہ شہ نے کہا۔ اے زمین کربلا
ہوشیار اس سے تو رہنا ہے یہ نازوں کا پلا
ساری مجلس میں مصائب کے بیان پر اہل مجلس آہ و بکا کرتے ہیں شیعوں
کے عقیدے میں یہ گریہ وزاری ہی مآل مجلس ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امام حسینؑ
کی پیدائش کے موقع پر پیغمبر خدا نے اپنی لخت جگر فاطمہ زہرہ کو شہادت حسینی
کی خبر دی تھی تو آپ اس روح فرسا کی خبر کی تاب نہ لا سکیں اور غش طاری ہوا۔

ہوش میں آنے کے بعد باپ سے پوچھا کہ آیا اس وقت آپ ہونگے یا علی ہونگے یا میں ہونگی یا حسن ہوگا۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اس وقت ہم میں سے کوئی نہ ہوگا اور حسین تین دن تک بھوکا پیاسا رہ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ قتل کر ڈالا جائے گا۔ جناب سیدہ نے گھبرا کر پوچھا "بابا! میرے بچے پر پھر کون روئے گا" آپؐ نے جواب دیا کہ خداوند عالم ایک گروہ پیدا کرے گا۔ جس کے مرد حسین اور رفقائے حسین پر جس کی عورتیں حسین کے اہل حرم پر اور جس کے بچے حسینؑ کے نوعمر اور صغیر سن بچوں کی شہادت پر تا قیامت گریہ کرتے رہیں گے۔ غرض مجلس کے آخر میں تمام اہل مجلس روضۂ حسینی کی طرف انگشت شہادت کا مختصر اُ عربی میں یہ زیارت پڑھتے ہیں۔

السلام علیک یا ابا عبداللہ۔ السلام علیک یا بن رسول اللہ۔

السلام علیکُ و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ پھر شاہِ خراساں امام رضا علیہ السلام کے روضہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں السلام علیک یا غریب الغربا السلام علیک یا معین الضعفا و الفقرا، السلام علیک ورحمتہ اللہ برکاتہٗ۔ پھر بارھویں امام علیہ السلام کو قبلہ کی طرف اشارہ کر کے اس طرح سلام کرتے ہیں السلام علیک یا صاحب العصر والزمان وخلیفتہ الرحمان وشریک القرآن الامان الامان ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ اس کے بعد برخاست کے وقت حاضرین مجلس کو فرداً فرداً تبرک تقسیم کیا جاتا ہے (روٹی وغیرہ کی قسم سے) بعض مجالس میں کھانے کا انتظام بھی کرایا جاتا ہے۔

* بعض مجالس میں ذاکری کی بجائے بانی مجلس اپنا سو سوا سو بند کا

نو تصنیف مرثیہ سنا تا ہے۔ چنانچہ بارہ محرم کو جناب باقر امانت خانی کے نئے مرثیے کی مجلس ہوتی ہے۔

آٹھ محرم کو حضرت عباس کی درگاہ میں تقریباً رات بھر دو دستی ماتم ہوتا اور بعد فجر علم اٹھایا جاتا ہے۔ شب عاشورہ اہل عزا شب بیداری کر کے مجلسوں میں شریک ہوتے اور عقیدتاً سر و پا برہنہ رہ کر مصروف ذکر حسین رہتے اور عاشورہ کے دن عصر تک فاقہ کرتے ہیں۔ اعمال عاشورہ (نماز وغیرہ) زوال آفتاب سے پہلے بجا لاتے ہیں۔

آداب مجالس: ان مجالس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ محرم سے پہلے ہر عزادار اپنے گھر کی صفائی اور آہک پاشی کرواتا۔ اور فرش و فرش سے گھر آراستہ کرتا اور سہ دس میں امام کے علم ایستادہ کر کے روزانہ عود و گل کا انتظام کرتا ہے۔ پورے عشرے میں روزانہ عزادار چھوٹے یا بڑے پیمانے پر (حسب مقدور) عقیدت اور طہارت کے ساتھ مجلسوں کا استفادہ کرتے

مخفی مباد کہ حضرت اسمٰعیل کا مقام ذبیح پر آنا آئ) ذبح عظیم (شہادت حسینی) کا پیش خیمہ تھا۔

ماتم حسین: ماتم کا طریقہ یہ ہے کہ ہر ماتم دار صف بستہ ہو کر یا حسین یا علی کہتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ زور، زور سے سینے پر مارتا ہے اس میں شدت پیدا کرنے کے لئے الات جارحہ قمع، چھچھی وغیرہ) سے کام لیتے ہیں اور اس طرح زخمی ہونے کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے حسینی معجزہ کی بدولت تمام زخم از خود مندمل ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس طرح علم لے کر حسین حسین

کہتے ہوئے دہکتی آگ پر سے گذر جاتے ہیں اور پاؤں مطلق نہیں جلتے۔

واقعہ کربلا کو جس طرح مسلمانوں نے مرثیہ کی شکل میں نظم کیا اسی طرح اسی طرح ہندو بھائیوں نے بھی بساط بھر کوشش کرکے اس موضوع پر قلم اٹھایا جیسے انیسؔ، دبیرؔ، جوشؔ، فراقؔ، ویسے ہی محروم جگنا تھ آزادؔ، آنند نارائن ملا اور دیگر حضرات سے بھی امام حسین کی شان میں نوحے اور مرثیے لکھے ہیں۔

نذر و نیاز

سے منی کی نیاز

حیدر آباد میں سے منی کی نیاز بڑے عقیدے سے منائی جاتی ہے۔ یہ نیاز میں ایک من بکرے کے گوشت کا قورمہ ایک من دہی اور ایک من نان پر حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتیؒ کے نام سے فاتحہ دلوا کر رشتے دوست احباب اور غریبوں کو کھلایا جاتا ہے۔ اس فاتحہ کا پکوان صرف مرد ہی کرتے ہیں۔ اس نیاز کا لوگوں کے کھا پی لینے کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے وہ گھر کے باہر لے جانے سے گریز کیا جاتا ہے اور زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ بو علی قلندرؒ ہندوستان کے ان اولیاء اکرام میں سے ہیں۔ جن کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ آپ کی ذات گرامی سے بحر العقول کرامتیں ظہور میں آئی ہیں۔ آپ کے والد شیخ فرید الدین عراقی بڑے عالم اور درویش تھے۔ اس فاتحہ کے سلسلے میں دہلی کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

آپ پانی پت کے باہر بہا گونی کے جنگل میں عبادت میں مصروف تھے۔ کہ ایک بارات کے شور و غل سے آپ کو ناگواری محسوس ہوئی اور آپ پر جلال کی سی کیفیت طاری ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری بارات غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی دولہا اور دولہن دونوں کے ہاں کہرام مچ گیا۔

تین دن تک سراغ لگانے کی انتہائی کوشش کی گئی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر ایک فقیر کے پاس پہنچ کر ساری داستان بیان کی تو اس فقیر نے کہا کہ قریب ایک خدا رسیدہ مست بوعلی قلندر عبادت میں مصروف ہیں جب وہ تیسرے پہر کو عبادت اور استغراق سے فارغ ہوں تو ان سے اپنی مشکل بیان کرنا۔ انشاء اللہ تمہارا کام ہو جائے گا۔ لوگ حضرت بوعلی قلندر کی خدمت میں پہنچے اس وقت دریا کے پانی سے کھیل رہے تھے۔ جم غفیر کو دیکھ کر "تو نے کیا چاہتے ہو؟" انھوں نے بارات کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے التجا کی تو آپ نے فرمایا کہ تین من کی نیاز خدا کے واسطے قبول کرو۔ تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔ انھوں نے یہ دینا بخوشی قبول کر لیا۔ آپ نے فرمایا "آنکھیں بند کرو اور پھر کہا آنکھیں کھول دو اور پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو۔ لوگوں نے دیکھا کہ بارات چلی آرہی ہے۔ لوگ حیران رہ گئے۔ شادی سے فارغ ہونے کے بعد لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ارشاد کے مطابق ایک من پکا ہوا گوشت ایک من میدہ کی چپاتیاں اور ایک من دہی آپ کی خدمت میں نیاز کے لئے لائے آپ نے قبول فرمایا اور ارشاد کیا ہمارے وصل بحق ہونے کے بعد اگر کسی کو کوئی تکلیف درپیش آئے تو خدا کی یہ نذر اس فقیر قلندر کی نیاز ماں جلال سے مہیا کر کے ہمارے خادموں مجاوروں غریبوں اور یتیموں اور عالموں کو کھلانے اور تقسیم کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب مشکلیں آسان کر دے گا۔ اس کی کمائی میں برکت دے گا۔ چنانچہ ہندوستان کے کونے کونے میں حضرت قلندر کی یہ نیاز دلائی جاتی

ہے اور لوگوں کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوتی ہے۔

رجب کے کونڈے: ہر سال رجب کی بائیس تاریخ کو حیدر آباد کے اکثر مسلم گھرانوں میں صبح سویرے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی نیاز کی کھیر پوریاں مٹی کے کنڈوں میں بھرے جاتے ہیں۔ ایک کمرے کو چونا ڈلوا کے صفائی اور طہارت کے ساتھ امام سے متعلق ایک کہانی پڑھی جاتی ہے اور آخر میں آپ کے نام کی فاتحہ دے کر بچے بڑے مہمان وغیرہ ان کھیر پوریوں سے سیر و سیراب ہو جاتے ہیں اور اس دن گوشت کا پرہیز کیا جاتا ہے۔ اور شام میں کونڈوں کے نیچے کی دال اور چاول کی کھچڑی پکائی جاتی ہے اور ماٹ کی بھاجی۔ وہی کچھ رات کے کھانے میں ہوتا ہے۔ دسترخوان پر کونڈوں میں کھیر پوریوں کے علاوہ حضرت علیؓ کے نام کے گھوڑے بھی رکھے جاتے ہیں۔ یہ گھوڑے دراصل ایک مٹھائی ہے اس کے پکانے کا یہ طریقہ ہے کہ میدے کو گوندھ کر اسکی پتلے مانڈے بنائے جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر انہیں گھی میں تل لیتے ہیں۔ دودھ ڈال کر پکاتے ہیں کھوا اور تلے ہوئے مغزیات شامل کر کے حسب ضرورت شکر الائچی زعفران ڈالکر پکاتے ہیں۔ یہ گھوڑے کہلاتے ہیں۔ ایک کونڈے میں گھوڑے، ایک ایک کونڈے میں کھیر اور پوریاں سرخ دسترخوان پر رکھے جاتے ہیں اور بعض لوگ بالائی اور جلیبی بھی رکھتے ہیں۔ حیدر آباد میں جو پوریاں پکائی جاتی ہیں ان میں پورن اور چوبا ہوتا ہے۔

کہانی: مدینہ طیبہ میں ایک لکڑہارا غربت سے بسر کر رہا تھا۔ جب افلاس ناقابل برداشت ہوگیا تو بیوی بچوں کو چھوڑکر طلب روزگار میں کہیں نکل گیا۔ مگر مصیبت ساتھ رہی۔ سوائے لکڑے کاٹنے اور بیچنے کے کوئی اور کام آتا نہ تھا بارہ برس اسی حالت میں گزر گئے مدینہ میں اسکی عورت ایک وزیر کے گھر میں جاروب کشی کرتی تھی۔ ایک دن وہ دروازے پر جھاڑو دے رہی تھی کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے اصحاب کے ساتھ ادھر سے گزرے اور ماہ و تاریخ دریافت کرکے فرمایا آج ۲۲ رجب کو جو شخص مقدور کے موافق میوے کی پوریاں پکاکر اور کھیر کو کونڈوں میں بھر کر ہمارے نام سے فاتحہ دیکر خدا سے اپنی حاجت مانگے وہ پوری ہوگی اگر نہ پوری ہو تو حشر میں میرا دامن پکڑتا۔ لکڑہارنی یہ سن کے منت کی کہ میرا خاوند جیتا جاگتا کما کے لائے میں نیاز کروگی۔ اس نے یہاں منت مانی وہاں لکڑہارے کو لکڑے کاٹتے ہوئے ایک دفینہ مل گیا وہ دولت مند ہوکے مدینہ لوٹا۔ بیوی کے لئے زیور لیا۔ شان دار گھر بنایا ٹھاٹ سے رہنے لگا۔ اس وزیر کی بیوی نے جس کے پاس لکڑہارنی کبھی جھاڑو دیتی تھی اس عورت کو طلب کرکے دریافت کی کہ یہ دولت کہاں سے آئی تو اس نے حضرت امام کا ارشاد سن کے منت و نیاز کرنے کا قصہ سنایا۔ وزیر کی بیوی نے اس کو باور نہ کیا تو خود اس وزیر پر ادبار آیا بادشاہ بدظن ہوا، خدمت سے برطرف کیا، جائیداد ضبط ہوئی اور نہ صرف اتنا ہی بلکہ شہزادہ جو ایک شب غائب ہوگیا۔ تو اس کے قتل کا الزام بھی اسی معزول وزیر پر لگایا گیا۔

رومال میں اس معتوب وزیر نے کھانے کے لئے خربوزے باندھ لئے تھے وہ کھول کر دیکھا گیا تو اس میں شہزادے کا سر نکلا۔ شاہی حکم ہوا کہ شب بھر اس کو قید میں رکھو صبح دار پر کھینچا جائے گا رات کو اس قیدی نے اپنی بیوی سے پوچھا کیا تجھ سے خطا ہوئی ہے کہ اس کے وبال میں یہ مصیبت ہم پر پڑی اس نے کہا کہ لکڑ ہارنی نے حضرت امام کا جو ارشاد سنایا اس کی اس نے تکذیب کی ہے معزول و قیدی وزیر نے کہا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا خطا ہوگی۔ فوراً توبہ کر۔ چنانچہ میاں بیوی دونوں نے توبہ کی اور نذر مانی جس کا یہ اثر ہوا کہ کھویا ہوا شہزادہ صبح ہی گھوڑے پر سوار آ گیا۔ قیدی کا رومال جو پھر کھول کر دیکھا تو اس میں سر نہیں اب خربوزہ ہی تھا۔ بادشاہ حیران ہوا۔ کیفیت دریافت کی اور جب امام کے قول کی تکذیب پھر اس سے رجوع کرنے کا حال سنا تو معزول وزیر پر مہربان ہوا۔ اُس کو خدمت پر بحال کیا خلعت سے سرفراز کیا اس کہانی کے ختم پر فاتحہ پڑھی جاتی پھر لوگوں کو کھلانا شروع کیا جاتا۔ کھیر پوریوں کا دستر خوان جس کمرہ میں ہوتا اُس سے علیحدہ دوسرے کمرے میں ایک اور دستر خوان بچھایا جاتا جس پر کھانا اور کئی کئی سالن ہوتے مگر سب بگھارے (بلا گوشت کے) مہمان جو صبح ناشتے کے وقت سے آفتاب کے غروب نہ ہونے تک اپنی اپنی فرصت سے آتے رہتے پہلے سالن کھانے کے دستر خوان پر بیٹھتے اس سے فارغ ہو کے ہاتھ دھوتے پھر کونڈوں کے دستر خوان پر جاتے اور کھیر پوری نوش کرنے کے اُسی کمرے میں ہاتھ دھوتے سیلفچی میں جو پانی جمع ہوتا وہ کسی پاک گوشہ میں ڈال دیا جاتا۔ اعتقاد

یہ بھی تھا کہ نیاز کا دستر خوان مغرب کے پہلے اٹھا دیا جائے اس لئے کھانا مغرب سے پہلے ختم کر دیا جاتا۔

عید میلاد النبی

ربیع الاول کا مہینہ رسول اکرمؐ کی پیدائش کا مہینہ ہے اس لئے یہ مہینہ بہت مبارک مانتے ہیں۔

میلاد النبی ۱۲ ربیع الاول کو ہر سال اس طرح منایا جاتا رہا ہے کہ اس روز مجالس وغیرہ کئے جاتے ہیں۔ اور گھر گھر میلاد شریف کرواتے ہیں۔ مولود پڑھنے والوں کو بلایا جاتا ہے اور قصیدہ بردہ شریف اور میلاد پڑھنے کے بعد نیاز کا کھانا بڑے پیمانے پر عوام اور خاص کو کھلایا جاتا۔ زمانے قدیم میں حیدرآباد میں مکہ مسجد علاوہ دوسری مسجدوں میں روشنی کی جاتی تھی۔ وعظ اور قصیدہ بردہ شریف مکہ مسجد میں کیا جاتا تھا۔ جہاں نواب میر عثمان علیخاں مولوی خیر الدین صاحب پھر ان کے بعد ان کے جانشین مولوی خیر المبین صاحب مرحوم کے وعظ سننے کے لئے نبی خانہ میں۔ جو پتھر گھٹی میں ہے مرد و نوکر میں بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے زنانے کے لیے پردہ کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ میلاد کے روز وعظ ہی میں مکہ اس دن خیر خیرات بھی کی جاتی تھی روشنی کی جاتی تھی پھر رات بھر واعظ اور میلاد شریف کی محفلیں ہوتی۔ صبح کی نماز کے بعد لوگ نظم جمعیت کے جوانوں اور مقامی عہدہ دار جلوس

کی شغل میں قریبی درگاہوں پر جاتے تھے۔ اس روز لوگ آثارِ مبارک جن کے مکانوں پر ہوتے یا مسجدوں میں ہوتے طہارت اور احترام کے ساتھ برآمد کرتے تھے عرق گلاب سے غسل دہ جاتا وہ پانی میں ملا کر لوگوں کو تقسیم کرتے تھے۔

بارھویں کا شوق میلاد سے زیادہ تھا اس نیاز میں کھیر پوریوں سے دعوت کی جاتی۔ غریب سے غریب لوگ بھی کھیر پوریاں ضرور پکاتے دعوتیں، فاتحہ نہیں دیتی تھیں فاتحہ کے وقت عود اور اگربتیاں جلائی جاتی تھیں

گیارھویں کی نیاز!

۱۱ ربیع الثانی کو حضرت غوث اعظم پیران پیر کی وصال کا دن آتا ہے۔ اس دن یا پورے مہینے میں کسی بھی دن گیارھویں کی نیاز جیسے بڑے پیر کی نیاز یا زدہم شریف بھی کہتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر یہ نیاز کی جاتی ہے عام دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس نیاز کو مشترکہ طور پر مسلمان اور ہندو سب ہی لوگ بڑے عقیدے اور طہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔

پیران پیر کی یہ نیاز زمانہ قدیم میں بھی اور آج بھی ہندو لوگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اہل محلہ سے چندہ وصول کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ عود دان لئے چند لڑکے تاشا مرفہ بجاتے ہوئے گھر گھر جاکے اس نیاز کا چندہ جما کرتے اور پھر عام دسترخوان ہوتے۔ فاتحہ کے بعد ہی بڑے پیر کا بڑا

جھنڈا گھروں اور دوکانوں اور چوراستوں اور بعض دفاتر میں بھی یہ نیاز کرکے جھنڈے چڑھائے جاتے۔

کرسمس:

حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش پر یہ عید منائی جاتی ہے۔ ایک دن پہلے گھر سجائے جاتے ہیں۔ کرسمس کیک بنائے جاتے ہیں ایک رات ایک ٹولی کرسمس جس میں خواتین اور بڑے مرد اور بچے سب گھروں پر آکے کرسمس کے گیت گاتے ہیں۔ ان لوگوں کو تحفے اور پیسے وغیرہ دیتے ہیں۔ صبح سویرے لوگ مقامی گرجاؤں کو جاتے ہیں وہاں لوگوں کو اپنے نجات دلانے گناہوں سے پاک ہونے کے لئے اللہ نے عیسیٰ مسیح کو بھیجا۔ جب گناہوں کی پر جاتی تھی۔ یہ خبر پادری لوگوں کو دیتا ہے۔ بائیبل پڑھنے کے بعد وعظ ہوتا ہے۔ اور پھر لوگ واپس ہوجاتے ہیں۔

نیا سال: ڈسمبر کی آخری رات میں بارہ بجے سے زیادہ اور مختلف گرجاؤں میں نئے سال کی آمد کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک عام عید ہوتی ہے۔ پہلی جنوری کو عیسائیوں کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی کیک سے ضیافت کرتے ہیں اس دن عام تعطیل دی جاتی ہے۔ یہ تقریب صدر میں بھی مشترکہ تقریب ہے۔ جو ہندو مسلم سکھ عیسائی سب ہی مناتے ہیں۔

گرجا سینٹ جارج

عیدین اور تہوار

عید الفطر: رمضان کی عید کہلاتی ہے۔ یہ عید یکم / شوال کو منائی جاتی ہے۔ معراج نبوی کے موقع پر جب خداوند عالم نے اُمت محمدی پر پچاس رکعت یومیہ نمازوں اور مسلسل تین ماہ کے روزوں سے مکلف کرنا چاہا مگر جب خدا کے چہیتے نبیؐ نے بارگاہِ الہٰی میں عذر پیش کیا کہ میری اُمت میں اتنی سکت نہیں ہے کہ عبادت کے لئے روزآنہ اتنی مشقت برداشت کریں اس پر رحمت الہٰی کو جوش آیا تو روزآنہ سترہ رکعت نماز اور ماہ رمضان کے تیس ۳۰ روزے فرض کئے۔

رمضان کا ہر روزہ سحری اور افطار پر مشتمل ہوتا ہے سحری کا یہ مطلب ہے کہ طلوعِ آفتاب سے کچھ اوپر ایک پہر پیشتر روزہ دار کچھ کھا پی لے۔ اور مقررہ وقت سے غروب آفتاب تک کھانا پینا بالکل ترک کردے خرمہ یا کھجور سے افطار کرے۔

سحری اور افطار کے وقت حیدرآباد میں حضور نظام ہفتم کے عہد حکومت تک توپیں داغی جاتی تھیں۔ اب اسکی بجائے سائرن بجایا جاتا ہے۔ حیدرآباد

میں رمضان کے پورے مہینے بھر مسلم گھرانوں میں روزوں کا خاص اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ بازاروں میں ہوٹلوں پر اور کھانے پینے کی چیزیں جن دوکانوں پر رکھی ہوں پر دے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ عید کی تیاریاں ہفتوں پہلے ہی سے شروع ہوجاتی ہیں۔ حیدرآباد میں پتھر گٹی اور لاڈ بازار کی ساری دوکانیں تقریباً رات رات بھر کھلی کی کھلی رہتی ہیں۔ مرد اور خواتین سے سڑکیں بھری رہتی۔ شہر میں گاؤں وغیرہ سے بھی لوگ عید کے لئے کپڑے، جوتے، چوڑیاں شیر خرمہ کے برتن۔ مہندی اور سنگھار کی مختلف اشیاء، خریدتے دکھائی دیتے ہیں۔ سارے شہر میں خوب روشنی کی جاتی ہے۔ اور درزی کی دوکانوں پر بھی بہت ہجوم رہتا ہے۔

مسجدیں آباد رہتی ہیں۔ تمام شہر کی مساجد کو روشنی کی جاتی ہے سحری کے وقت فقیر گاکر "سحری کرو اٹھو" "رمضان کے روزہ دارو!" کی صدائیں رات دیر گئے لگاتے ہیں۔ لوگوں کے گھروں پر کھٹکے مار مار کر اٹھاتے ہیں۔ خصوصاً بچے نیند سے ہوشیار ہو کر بڑوں کے ساتھ سحر میں شریک ہوتے اور روزہ رکھنا چاہتے ہیں مسلمان اپنی اپنی حیثیت کے موافق خیر خیرات کرتا ہے، بے نمازی اور شرابی بھی اس مہینے میں عبادتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کہیں بچوں کی روزہ کشائی کی رسمیں ہوتی ہے اور کہیں افطاری کی دعوتیں کی جاتی ہیں اس مہینے میں مسلمان دل کھول کر خرچہ کرتے ہیں۔ ذکواۃ جن لوگوں کو فرض ہے نکالتے ہیں۔ مساجد میں روزہ داروں کے لئے افطاری گھر گھر سے بھیجی جاتی ہے۔

افطار یعنی روزہ کھولنے کے وقت جو افطاری مہیا کی جاتی ہے زمانہ قدیم میں کمہاروں کے پاس سے مٹی کی سینکیں خرید لی جاتی تھیں۔ ہر سینک میں کھوریں، ابلی ہوئی چنے کی دال جس پر سیاہ مرچ اور نمک چھڑکتے۔ کچھ میوے جیسے کہ موز اور جام، موسمی وغیرہ اور اس کے ساتھ مٹی کے کٹوریوں میں جمی ہوئی فرنی ہوتی یا ہریس ہوتی۔ حلیم یا ہریس افطار میں اسلئے رکھی جاتی ہے کہ وہ مقوی غذا ہے جو گیہوں اور گوشت سے بنائی جاتی ہے۔ لوگ روزہ کھولتے ہی مغرب کی نماز کو چلے جاتے ہیں۔

رمضان میں تقریباً رات بھر لوگ ہوشیار رہتے ہیں مصروف عبادت بھی۔ تراویح کی نمازیں۔ ختم قرآن میں مصروف ہوتے ہیں۔ رمضان بڑا برکتوں کا مہینہ ہے اس مہینے کے ختم پر شوال کے چاند کی طرف لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں۔ جیسے ہی عید کا چاند نظر آجائے۔ خواتین گھروں کی صفائی اور عید کے پکوان، لباس وغیرہ کی تیاری میں مصروف ہوجاتی ہیں

عید کے خاص پکوان کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ ہمہ اقسام کے عطریات خریدے جاتے ہیں خاص قسم کے عطردان ہوتے ہیں پہلے زمانے میں چاندی اور بدری کام کے عطردان جو بڑے خوبصورت اور قیمتی ہوتے استعمال کئے جاتے تھے۔ امراء میں تو مختلف اقسام کے قیمتی عطریات جمع رکھنے کا شوق تھا۔ ہر گھر میں عید ملنے کے لئے آنے والوں کی شیر خرمہ، عطر اور پان سے تواضع کی جاتی۔ مسلمانوں کی اس عید میں ہندو بھائی بہنیں بھی عید ملنے آتے ہیں عید کی ملاقات عید کی نماز سے گھر کے زد واپس گھر آنے پر شروع ہوتی ہے۔ عیدین کی مہمانی اور خوشی

تین دن تک جاری رہتی۔ جھگڑے ہوئے لوگ بھی عید ہی کی خوشی میں آپس میں مل لیتے ہیں گلے ملتے ہیں عیدوں میں بچوں اور کم عمر لڑکوں کو عیدی اور نوکروں اور خادموں کو انعام دینے کا رواج ہے۔

عید کی نماز کو گھر والے جانے سے پہلے ہی فطرہ شرعی حکم کے لحاظ سے غربا اور مساکین کو دیدیا جاتا ہے۔ ذکوٰۃ اگر رمضان کے پورے مہینے میں نہ دے سکیں تو نماز سے پہلے دے دی جاتی ہے

سب لوگ نہا دھو کر نئے کپڑے پہنتے عطر اور سرمہ لگا کر نماز کی عید کیلئے زرہ اچکنوں اور ٹوپیوں میں ملبوس یا پھر سفید کرتے پاجامے اور سفید نون جیسا بھی ہو پہن کر ہاتھ میں سماں کئے ہوئے جب گھروں سے نکلتے ہیں اللہ کی حمد و ثنا یعنی تیرا کلمہ پڑھتے ہوئے مسجد یا عید گاہ یا مکہ مسجد کو جاتے ہیں۔

سابق میں عیدین کی نمازوں کے موقع پر محکمہ امور مذہبی سے عید گاہ کے پورے احاطے میں عمدہ قسم کی جا نمازیں بچھائی جاتی تھیں۔ خوبصورت شامیانے لگائے جاتے تھے۔ وضو کے لئے پانی کا معقول انتظام رہتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مکبران چوکیوں پر کھڑے ہو کر تکبیر بہ آواز پڑھتے تھے۔

... عید کی دو رکعت نفل نماز کے بعد ہی خطبہ میں بادشاہ کا نام لیا جاتا تھا۔ اکیس توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ عید کی نماز کے موقع پر خطیب کو قیمتی شال اڑھائی جاتی تھی۔ نماز کے ختم ہونے پر عید گاہ کے باہر پرچم آصفی کو فوج اور پولیس سلامی دیتی تھی۔ عید کی نماز کے لئے احکام جلوس کے ساتھ جاتے تھے اور نماز ختم ہونے تک بیرون عید گاہ ایک شامیانے میں

جہاں ان کے بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ٹھیرتے۔

پھر پرچم آصفی کو سلامی دینے کی رسم کے بعد جلوس میں شامل ہو کر واپس ہوتے۔ عیدگاہ اور مساجد کے عید کے پر تکلف انتظامات جو حیدرآباد کے ہیں بھی ہوتے ہیں۔ حیدرآباد سے باہر کسی نظر میں آتے۔ اسی طرح مختلف تہواروں میں مسلمان لوگ ہندؤں کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے بلا تفریق مذہب و ملت ایک دوسرے سے "آداب عرض ہے" اپنا سیدھا ہاتھ اٹھاکر دو تین سلام جو مخصوص انداز سے جو حیدرآباد میں سلام کرتے۔ مصافحہ کر کے گلے ملکر مہمان کو بٹھاتے پہلے نشتیں فرش پر ہوتی تھیں۔ عید کی اس ملاقات میں مہمانوں کی ضیافت شیر خرمے سیویاں کے بعد میں لی و عطر سے ہوتی۔ سارا دن میل میں خوشیوں ہنسی میں گزر جاتا۔ عید کی ملاقات کیلئے خواتین اکثر عید کے دوسرے دن قریبی رشتہ داروں سے ملنے آیا جایا کرتیں،

عید الضحیٰ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے "اے ابراہیم اٹھ۔ قربانی کر" اس خواب کی تعمیل میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے دوسو اونٹ ذبح کئے۔ یہی خواب تین دن تک دیکھتے اور ہر دن دو دوسو اونٹوں کی قربانی کی۔ چوتھی شب کو خواب میں یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو قربان کر۔ انھوں نے بی بی حاجرہ سے کہا کہ وہ نوسالہ اسمٰعیل کو سر میں کنگھی کر کے سر کے بالوں کو مشک و عنبر سے معطر کرے اور آنکھوں میں سرمہ

لگا کر پاک صاف لباس پہنا دیں۔ مجھے بچے کو اپنے ہمراہ دعوت میں لے جانا ہے۔ چنانچہ جنابہ حاجرہ (والدۂ اسمٰعیل) نے اپنے لختِ جگر کو نہلا دھلا کر پاکیزہ کپڑے پہنائے اور بناؤ سنوار کر کہا کہ بیٹے اپنے باپ کے ساتھ دعوت میں جاؤ۔ اس نبی زادے نے اپنے باپ حضرت ابراہیم سے پوچھا کہ بابا مجھے آپ کہاں لے جا رہے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم نے اپنے خوابوں کی تفصیل بیان کی انھوں نے اپنے بیٹے کو ذبح ہونے کے لئے بالکل آمادہ پایا۔ اور بیٹے نے کہا کہ "اللہ کے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کیجئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے مطیع اور صابر پائیں گے۔ کہیں شیطان حائل نہ ہو۔ آپ نے فرمایا اس ملعون پر پتھر مارو، تب باپ بیٹے نے شیطان پر پتھر پھینکے اور دونوں اس مقام پر پہنچے جسے منا کہتے ہیں۔ جب ذبح کا موقع آیا تو بیٹے نے کہا بابا پہلے میرے ہاتھ پیر باندھ دیجئے تاکہ محبت پدری حکم خدا کی تعمیل میں حائل نہ ہو۔ جناب ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا اور صدق دل سے بیٹے کی گردن پر چھری پھیر دی۔ مگر عین اسی وقت حکم خدا سے جبرئیل اُترے اور جناب اسمٰعیل کو ہٹا کر ایک دنبہ لا رکھا اور وہی ذبح ہوا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے پٹی کھولی تو بیٹے کو صحیح سالم پایا اور دنبہ کا ذبیحہ دیکھا۔ چونکہ حضرت ابراہیم نے ۸/ ۹/ اور ۱۰ ذی الحجہ کو یہ خواب دیکھا تھا اس لئے سنت ابراہیمی کی اس تعمیل میں بقرعید منائی جاتی ہے۔ اور صاحب استطاعت مسلمانوں پر بکرے اور گائے یا اونٹ کی قربانی ہر صاحب استطاعت بالغ مسلمان مرد اور عورت پر فرض کی گئی ہے اسی طرح زندگی میں ایک بار حج بیت اللہ بھی صاحب

استطاعت مسلمانوں کے لئے فرض کیا گیا ہے۔ حج بیت اللہ کے دن لوگ حیدرآباد میں عرفہ کرتے ہیں یعنی مردوں کے نام سے فاتحہ دلوا کر کھانا وغیرہ محلے والوں اور قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ دوسرے دن عید ہوتی ہے۔

عیدالفطر کی طرح عیدالضحیٰ میں عیدگاہ کا منظر، نماز اور ملاقات کی کیفیت وہی ہوتی ہے۔ اس عید میں نماز عید کے بعد قربانی کرنے کے احکام ہیں عیدالفطر کے وقت اکثر لوگ سالانہ کپڑے بنا لیتے ہیں اس لئے اس عید میں کپڑوں کی خریدی کم ہوتی ہے۔ تین دن تک لوگ قربانی دیتے ہیں اکثر لوگ گوشت کے کباب بنا کر سکھا لیتے ہیں جو کئی دن تک اسی حالت میں رہتے ہیں۔

عیدِ نوروز

یہ عید دراصل ایران سے ہنا لی آئی۔ پارسی اس عید کو مناتے ہیں۔ شہر حیدرآباد میں محمد قلی قطب شاہ نے بین القوامی تمدن پیدا کیا تھا اور اس شہر میں ایسی فضا بنائی تھی کہ سب ہی طبقے کے لوگوں کا اس نے دل موہ لیا تھا۔ اس نے خالص اسلامی عیدوں اور بھی تقریبیں رائج کی تھیں جن میں عید نوروز بھی ایک عید ہے۔

علم نجوم کے لحاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ جب سورج بارہ برسوں کی گردش کرتا ہو خطِ مستقیم پر آجاتا ہے تو ایک سال پورا ہو جاتا ہے۔

اور جس روز سورج یا زمین کا ایک چکر ختم ہوکر نیا چکر یا دور شروع ہوتا ہے تو اس کو نوروز کہتے ہیں۔ اور اس دن دوسرے تمام سیاروں کے مقامات کے لحاظ سے آنے والے پورے سال کے حالات کے متعلق پیش قیاسی کیجاتی ہے۔

گولکنڈہ میں ہر نوروز کے دن نوروز کی خاصیت سے جیسے جو اثرات مرتب ہوتے تھے ان چیزوں کے بارے میں شاہی دربار میں ماہرانِ علم نجوم پیش کرتے نوروز کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس روز دنیا ایک نئی کروٹ بدلتی ہے جس کی وجہہ سے ہر چیز تروتازہ اور نئی ہو جاتی ہے اس روز دو دو وظائف پڑھے جاتے تھے۔ اور دعائیں کی جاتی تھیں

ماہرین نجوم کا خیال ہے جب آفتاب برج میں داخل ہونے لگتا تو خوشبودار بخور (اگربتیاں) روشن کی جاتی تھیں اور پاک صاف لباس پہن کر لوگ خدا کی عبادت کرتے ہیں اس سلسلے میں عامل لوگ بہت روپیہ کماتے زائچہ نکالتے، وراس کے لحاظ سے عید نوروز بہت مبارک گھڑی ہے کیونکہ اس کے برج میں زہرہ اور مشتری واقع ہوتے ہیں۔

بسنت یا بسنت پنچمی کا تہوار

یہ ہندوؤں کی عید ہے جو موسم بہار میں منائی جاتی ہے جبکہ پھول کثرت سے کھلتے ہیں بسنت سنسکرت لفظ وسنت ہے جس کے معنی سال کی پہلی فصل کے ہیں یہاں سے موسم بہار شروع ہوتا ہے۔ یہ پہلی فصل چیت اور بیساکھ تک رہتی ہے اس زمانے میں چونکہ پھولوں کی کثرت ہوتی ہے اسلئے ہندو لوگ پھول جمع

کرکے دیوتاؤں کے مندروں اور تالابوں کو دے جاتے تھے اس طرح یہ رفتہ رفتہ یہ ایک عید یا میلہ بن گیا۔ بسنت کو حضرت امیر خسروؒ کے زمانے سے دلی مسلمانوں نے بھی منانا شروع کر دیا تھا وہاں بزرگوں کی درگاہوں پر بھی مسلمان پھول لے جاکر چڑھایا کرتے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ بسنت کی تقریب کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا کرتا تھا۔ قطب شاہی دور میں ہندوؤں کے ساتھ بادشاہ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی بسنت کی تقریب مناتے تھے بسنت کے روز دھوم دھام سے رنگ کھیلے جاتے تھے۔

مرگ عوام کی عید ہے۔ اپریل اور مئی کی چلاتی گرمیوں کے بعد جب بارش ہونے لگتی ہے۔ اس وقت عجیب کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ زمین کے ذرہ ذرہ جان پڑ گئی ہے اور یہیں سے موسم برسات شروع ہوتا ہے۔ مرگ کے دن کہتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ بھی بڑی دھوم دھام سے مجلس آراستہ کرتا تھا۔ اسکی باراں نیاز یاں بھی سرخ لباس میں اس روز پہنتی تھیں۔ پھول اور پان کے طبق تقسیم کئے جاتے تھے قطب شاہی دور میں مرگ ایک عید کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بادشاہ اور عوام سب ہی برسات کی آمد پر مسرور رہتے تھے۔

مرگ کے دن حیدرآباد میں اکثر لوگ مچھلی کا سالن پکاتے ہیں اور زمانہ قدیم میں بچوں کو پتنگ اور گڑ کھلاتے تھے۔

اُگادی:

تلگو سال شروع ہوتا ہے۔ اس تہوار میں لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں
نیم کا پھول، گڑ، کیری اور نئی املی کا اس ڈالکر یہ شربت بنایا جاتا ہے ایک وہم
یہ ہے کہ اگر کسی کو یہ شربت میٹھا لگے تو وہ سال ان کے لئے بہت مبارک مانا
جاتا ہے۔ اگر مزہ خراب لگے تو وہ منحوس خیال کیا جاتا ہے۔
جوتشی برہمن پنچانگم یعنی ایک پیشن گوئی جو سال بھر کے لئے نکالی جاتی
جس میں مبارک اور منحوس گھڑی کے بارے میں بحث کی جاتی ہے اگادی
کے دن سے دیکھی جاتی ہے۔

دیپاولی

روایت یہ ہے کہ نرکاسٹر نام کا ایک ظالم راجا جو راکشش تھا وہ
لوگوں کو تنگ کر رکھا تھا اور لوگ دعا کرتے تھے کہ یہ ظالم جلد مرجائے کرشن
بھگوان کو پراتھنا کرتے تھے کہ ایک دن لارڈ کرشنا اپنے زوجہ ستیہ بھاما
اور عوام کے [illegible] کے ہمراہ نرکاسر کے پاس گئے اور بڑی خوفناک جنگ
ہوئی۔ کرشن بھگوان ان دونوں کی لڑائی میں بے ہوش ہو گئے کہ
اس وقت ان کی بیوی ستیا بھاما نے اس راکشش کو مار ڈالا۔

دیپاولی میں رات کو پٹاخے جلانے کے بعد جب لوگ میٹھا ضرور کھاتے ہیں۔ اس تہوار میں مٹھائی ضرور بنائی جاتی ہے ہندو حضرات کا یہ سب سے بڑا تہوار ہے لوگ نئے کپڑے بناتے ہیں دیوالی کی رات بہت خوبصورت رات معلوم ہوتی ہے پٹاخوں کی روشنی اور دھوم دھام سے بھی یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

اس ظالم کے مرنے کے بعد لوگ بہت خوش ہو گئے اور گھر گھر دیپ لگا کر خوشیاں منائیں۔ اسی وجہ سے دیپاولی کے پہلے دن نرکا چتر دسی کہتے ہیں اس روز لڑکیاں گھر والے مردوں اور لڑکوں کی آرتی اتارتے ہیں۔ دیپاولی کو روشنی یا دیپوں کا تہوار کہتے ہیں۔

تلسنکرات :

یہ ہندو مسلم اتحاد کا تہوار ہے اس دن سارے ہندوستان میں پتنگ بازی کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے اس تہوار میں مسلمان بھی شریک رہتے ہیں ملک کی ترقی کے لئے آپسی میل ملاپ اور بھائی چارگی ضروری ہے۔ یہ تہوار جنوری کے مہینے کی ۱۳/ یا ۱۴/ تاریخ کو منایا جاتا ہے ہندو عقیدے کے مطابق سورج دیوتا ایک راشی سے نکلکر دوسری راشی میں داخل ہوتے ہیں لوگ ان دن روزہ رکھتے ہیں اس دن تل اور سونے کا خریدنا مبارک سمجھا جاتا ہے ہندو بھائی اسی روز گنگا میں نہاتے ہیں۔ یہ تہوار تین دن تک منایا جاتا ہے۔ عورتیں گھروں کے سامنے رنگولیاں ڈالتی ہیں اس روز سہاگنیں اور لڑکیاں

اپنے رشتہ دار اور پڑوسی عورتوں کو مدعو کرتی ہیں۔ تلسنکرات میں اکثر چوڑیاں کھلونے وغیرہ آپس میں بطور تحفہ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ بنارس کی صبح اور لکھنو کی شام کی طرح شہر حیدرآباد اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لئے مشہور ہے نیلے آسمان پر جب رنگ برنگی پتنگ اڑائے جاتے ہیں تو بڑا خوبصورت منظر ہوتا ہے پتنگوں کے نام بھی بڑے دلچسپ ہیں جیسے لہنگا، چاند تارا، گدھی، دولھن، پری دار، دو بان، دو قلم، گلہری، سنگھاڑ، ملی بن، شطرنج، پچیں وغیرہ تلسنکرات کا یہ تہوار اتحاد ملاپ اور دوستی پیدا کرتا ہے۔

ناگ پنچمی :

یہ تہوار ساون کے مہینے میں شکل پنچمی کو منایا جاتا ہے اس دن سانپوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ تہوار سارے ہندوستان میں منایا جاتا ہے اس تہوار کے پس منظر میں کچھ کہانیاں پرانوں میں ملتی ہیں ان میں مشہور کہانی یہ ہے کسی گاؤں کے ایک جنگل میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی اتفاق سے ہل کے پھل سے ایک ناگ اور اس کے تین بچے ختم ہو گئے۔ ناگن کے من میں اس کسان سے بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوا۔ رات کے وقت جب کسان اور اس کے بیٹے ایک جگہ سو رہے تھے ناگن نے وہاں جا کر ان کو ڈس دیا۔ اور وہ مر گئے کسان کی بیٹی کسی اور جگہ سو رہی تھی دوسرے دن لڑکی اس مقام پر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ اس رات ناگن اس لڑکی کو بھی ڈسنے کی غرض پہنچ گئی۔ لڑکی نے ناگن سے بہت منت اور سماجت کی اور اپنے بچاؤ کے لئے

دودھ سے بھرا کٹورہ ناگن کے سامنے رکھ دیا۔ ناگن دودھ پی کر چلی گئی۔ یہ دن
شراون شکل پنچمی کا تھا جو سپیروں کا سب سے بڑا اور اہم دن مانا جاتا ہے
اس سال سے یہ ناگ پنچمی کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس دن سہاگنیں اور لڑکیاں
پان سپاری اور پھل سے ایک دوسرے کی خاطر داری کرتی ہیں۔ یہ تہوار دو دن
تک منایا جاتا ہے پہلے دن عورتیں سر سے نہاتی ہیں اور روزہ رکھتی ہیں دوسرے
دن سانپوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس دن
سپیرے ناگوں کو پٹارے میں لئے گھر گھر پھرتے تھے۔ عورتیں ان کو بلوا کر
سانپوں کو دودھ پلایا کرتیں۔ ناگوں کی پوجا کے بعد برہمنوں کو کھانا
کھلایا جاتا ہے۔ عید عقیدوں کی بنا پر یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ اس دن
زمین کی کھدائی نہیں کی جاتی، اور اپنے دل میں سانپوں کے بارے میں برا
خیال نہیں لانا چاہیئے۔ اس دن کوئی سبزی یا ترکاری بھی نہیں کاٹی جاتی
کہا جاتا ہے کہ جو لوگ سانپوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں وہ برائی نہیں
نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر کسی کے سانپ کو چھیڑا تو سانپ کبھی اس کو نہیں چھوڑتا
تھا تما گاندھی نے بھی سانپوں کو مارنے سے منع فرماتے تھے۔ لوگ سانپوں کے
پٹھوں میں دودھ لے جا کر ڈالتے ہیں۔
سر خورشید جاہ مرحوم ناگ پنچمی میں بڑی شان کی دعوت کرتے تھے۔

جنم اشٹمی:

ہندؤں کا اہم تہوار ہے اس دن لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ رات کے

بارہ بجے کرشن جی کا جنم مناتے ہیں۔ سری کرشن جی کی مورتی کو جھولے میں ڈالکر گیت گاتے ہیں سری کرشن جی ۵۰۰۰ قبل مسیح کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اس وقت متھرا میں کنس کا راج تھا۔ واسودیوا ور دیونکی کرشن جی کے ماتا پتی کو کنس اقتدار کی حوس میں بند کر رکھا تھا کرشن جی قید کی چار دیواری میں پیدا ہوئے اس وقت خدا نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا۔ بارش اب زوروں پر ہو رہی اچانک قید کے دروازے کھل گئے۔ واسودیو کے ہاتھوں اور پیروں کے طوق خود بخود کھل گئے۔ واسودیو اس نومولود بچے کو ٹوکرے میں ڈالکر ٹوکرا سر پر رکھ کر موسلار دھار بارش میں قید خانہ سے نکل پڑے اور لیشو دھا گوپن جس کی کوئی اولاد نہ تھی قید خانہ واپس چلے گئے۔ جب واسودیو متھرا لوٹے تو کنس کو اس بات کی خبر ہوئی اور کنس کے دل میں آگ لگ گئی پہلے ہی کرشن نے ان کے سات بچے مار ڈالے تھے۔ اب وہ اس بچہ کو بھی ختم کرنا چاہتا تھا اور اس میری خواہش سے کرشن قید خانے میں آتا ہے وہ بچہ کی بجائے ایک چھوٹی سی بچی کو وہاں پاتا ہے۔ کنس اس بچی کو مارنے کیلئے اس کے دونوں پیر پکڑ کر زمین پر پٹکنا چاہتا ہے کہ ننھی بچی آسمان کی طرف پرواز کرکے غائب ہو جاتی ہے اور آسمان سے ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ اے نادان جنکو تو مارنا چاہتا ہے وہ خیر و عافیت کے ساتھ گوکل پہنچ گیا ہے۔ اب تیرے برے دن آگئے ہیں اب وہی کرشن تیرا خاتمہ کرے گا۔ کنس کے دل میں ظلم کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا

ادھر گوکل میں کرشن جی نند اور لیشو ردھا کے پاس نازوں سے پلتے رہتے۔ وہاں گوپیوں سے پیار کرتے کھیلتے کودتے اور خوب شرارتیں کرتے تھے

آخر کار حالات کے پیش نظر اور عوام کے اصرار پر وہ گوکل کو چھوڑ کر متھرا میں آگئے۔ کنس کو ختم کر کے راج بھاٹ سنبھالا۔ مشہور ہے کہ کرشن جی بھی ایک عظیم المرتبت بادشاہ تھے لیکن ان میں غرور اور بکبری نام کو نہیں تھا۔ چنانچہ جب انکے بچپن کے ساتھی سداما جو ایک غریب برہمن تھے۔ ان کے دربار میں جب وہ ملنے آئے تو کرشن جی نے دوڑ کر انکا استقبال کیا۔ کرشن جی نے حق کے لئے پانڈوں کو جنگ کرنے کی طرف راغب کیا۔ شریمت بھگوت گیتا کے ذریعہ انہوں نے نصیحتیں کیں جو کوروں اور پانڈوں کی جنگ کا ایک حصہ ہے۔ مہابھارت کی لڑائی اٹھارہ دن تک چلتی رہی۔ بھگوت گیتا کے اٹھارہ باب ہیں اس کتاب سے سری کرشن جی کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ جنم اشٹمی کے دوسرے دن بھی پوجا کی جاتی ہے۔

دسہرہ:

دسہرہ کو وجے اشٹمی (دشمی) بھی کہتے ہیں ہندوؤں کا یہ اہم تہوار ہے۔ اسوج شکلا دس دن منایا جاتا ہے۔ دسہرہ کے دن رام لیلائیں یا رام کتھائیں سنائی جاتی ہیں اس دن مندروں اور گھروں میں بھجن گائے جاتے ہیں ان کہانیوں میں رام کا ایثار، بھرت کی اطاعت گزاری لکشمن کا پیار، سیتا کی پتی بھگتی ان سب واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پرانوں میں اس تہوار کے سلسلے میں کئی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔

مذہبی نقطہ نظر سے لوگ نو دن تک پوجا کرتے ہیں اور دسویں دن دسہرہ

کرتے ہیں۔ عمدہ عمدہ میٹھے اور مختلف قسم کے کھانے پکائے جاتے ہیں میٹھی روٹی،
پورن پوری اور شیر قند بھی بناتے ہیں۔ لوگ پوجا کرتے ہیں آم کے پتوں اور گیند
کے پھولوں سے گھر سجاتے ہیں اس تہوار میں عام طور پر عورتیں بتکما کھیلتی ہیں۔ بتکما
کے سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی ہے۔ سکتاہے کہ ایک غریب برہمن سے بہت التجا
کیا کہ وہ اس کو اولاد ہونے کے لئے دعا کریں خدا کے فضل سے اس برہمن کی دعا
قبول ہوگی اور عورت کو بچہ ہوا برہمن کے پاس حاضر ہوکر اس نے شکرانہ ادا کیا۔
برہمن نے اس عورت کو برتکما کہا جسکے معنی سکھی رہو کے ہیں، عام بول چال میں
یہ بتکما بڑگیا دوسرے یہ لفظ موسم بہار کی آمد کی ترجمانی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ راجہ رام چندر جی نے اسی دن لنکا پر چڑھائی کی تھی۔ راون کا ناس کیا۔
گو بدی پر نیکی کی فتح کا یہ تہوار ہے۔ نومی کے دن لوگ، گاڑیوں، مشینوں
ریلوں اور کارآمد نئی اشیاء کی پوجا کرتے ہیں۔ اس ایودھ پوجا کہتے ہیں؛
سُنا ہے کہ پانڈوں نے بھی بن باس کے زمانے میں اپنے ہتیار جمی کے درخت کے
پیچھے چھپائے تھے اس دن اس درخت کے پتوں کی بھی پوجا کرتے ہیں اس شام
کو لوگ مندروں میں جاتے ہیں نو دن تک لوگ روزہ رکھتے ہیں اور دسویں
دن تہوار مناتے ہیں دیوی کا پوجا کرتے ہیں آپس میں ملاقات کرتے ہیں۔ بلا
لحاظ مذہب و ملت سب کی خاطر تواضع کی جاتی ہے اس رات میں راون کے
پتلے کو نظر آتش کیا جاتا ہے۔ اس منظر کو دیکھنے کے لئے لوگ ہزاروں کی تعداد
میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جلتے ہوئے پتلے کو دیکھ کر لوگوں کے دل میں یہ احساس
پیدا ہو جاتا ہے کہ برائی کا نتیجہ برا ہوتا ہے گناہ ہی کرنا چاہیے۔ لنکا کو

ہنومان سے اور راون کو رام نے نذرِ آتش کیا۔ اس طرح سے کہ دنیا سے ظلم و ستم ختم ہو جائے اور لوگ نیک بن جائیں۔

نیل کنٹھ یا پالا مپٹا ایک نیلے رنگ کا پرندہ ہوتا ہے دسہرہ کی شام میں لوگ اس پرندے کو خرید کر آزاد کرتے ہیں کیونکہ اس دن اس پرندہ کو دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا ہے۔ غرض یہ تہوار بھی مشترکہ تہذیب آپسی اتحاد تمدنی کو فروغ دیتا ہے۔

فنونِ لطیفہ

موسیقی: دکن میں موسیقی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود دکن ہے۔ بہمنی زمانے سے اس کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے بہمنی سلطنت کے دوسرا بادشاہ محمد شاہ بہمنی کی عہد حکومت اس بادشاہ کے موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس کے دور حکومت میں ۱۳۶۲ء صرف دہلی سے تین سو قوالی آئے تھے۔

بہمنی حکومت کے بعد جب دکن میں پانچ سلطنت قائم ہوئیں۔ ان میں سے بیجاپور کی عادل شاہی احمد نگر کی نظام شاہی اور گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنتیں ایسی تھیں جن کے حکمرانوں نے موسیقی سے دلچسپی لی۔ عادل شاہ اور پھر اس کے جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی موسیقاروں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ابراہیم عادل بھی موسیقی کا شیدائی تھا اور خود بھی اس فن اور استادانہ درجہ رکھتا تھا اس نے اپنی کتاب "نورس" میں کئی راگ راگنیوں کے لئے مختلف گیت موزوں کئے تھے۔ اس کے زمانے میں بیجاپور میں چار ہزار موسیقار موجود تھے اس نے موسیقی میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اسے فیثا غورث کا ثانی کہتے تھے۔ فیثا غورث موسیقی کا موجد مانا جاتا ہے۔

قطب شاہی سلاطین بھی ناچ گانے کے رسیا تھے۔ محمد قلی قطب شاہی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں دہلی، لکھنؤ، آگرہ، لاہور، کابل کرناٹک، احمد آباد اور برہان پور وغیرہ سے طوائف اور موسیقار آکر گولکنڈہ میں بس گئے تھے۔ بعض محلے اور آبادیاں انھیں سے آباد تھیں سلطان عبداللہ قطب شاہ موسیقی کا ماہرین فن تھا۔ اس نے بہت سے راگ راگنیوں کیلئے بیشمار گیت موزوں کئے تھے قطب شاہی سلطنت کا آخری تاجدار عبدالحسن تانا کے کے ہاں بھی عیش و طرب کی محفلیں گرم رہتی۔ اس کے عہد میں تارامتی اور پریم متی یہ دونوں ناچنے والیاں بہت مشہور ہوئیں۔ جو قلعہ گولکنڈہ کے فوج رہنے کے لئے عالیشان محل بنائے گئے تھے۔ تارامتی کے بارے میں یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ وہ چاندنی راتوں میں اپنے محل سے ایک مضبوط رسی پر رقص کرتے ہوئے بادشاہ کو مجرہ دینے کے لئے قلعہ گولکنڈہ تک جایا کرتی تھی۔ دکن میں فن موسیقی کی شاہانہ سرپرستی کی وجہ سے تان سین کے خاندان کے کئی افراد یہاں آکر بس گئے تھے۔

دولت آصفیہ کے دور میں نظام علی خان کے زمانے میں ماہ لقا بائی چندا کا نام اب بھی حیدرآباد میں مشہور ہے۔ اس نے اپنے کمال فن سے موسیقی میں چار چاند لگادیئے تھے۔

ماہ لقا بائی چندہ کی بیٹی حسین لقا بائی بھی آسمان موسیقی پر بدر کامل کی طرح جگمگاتی رہی

آصف جاہ ثانی کے عہد میں ارسطو جاہ نے بھی دور علم و ادب فنون لطیفہ

کی عظیم الشان سرپرستی کی تھی۔ اسی زمانے میں بہت سے موسیقار شمالی ہند سے حیدرآباد آ چکے تھے اور کئی تو بلوائے گئے اور حکومت نے ان کیلئے تنخواہیں بھی مقرر کر دی تھیں اس طرح حیدرآباد میں موسیقی کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ طوائف، موسیقار، قوال اور گانے والے نے اس فن میں بڑی شہرت حاصل کی۔

آصف جاہی دور کے آخری زمانے حیدرآباد کی طوائف ٹیٹی جان اور وحیدن بائی، کالی جان، مہتاب بیگم، شنکری بائی، شمشاہ بیگم اور ملا وغیرہ کسی نہ کسی وجہ سے شہرت رکھتی تھیں۔

ایک زمانہ آیا جب کہ طوائفوں کی حالت ابتر ہونے لگی اور ان اخلاق و آداب بگڑنے لگے ان کی قابلیت نابود ہو گئی اور وہ بالکل بازاری عام عورتوں کی طرح رہ گیا جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک جا سکتا تھا۔ شرفا ان کے جلسے چھوڑ دیے۔ موسیقی کو بھی زوال آ گیا اور شرفا اس سے ناواقف ہو گئے

ایک زمانہ تھا کہ ہماری خواتین طوائفوں کا گانا معیوب تصور کرتیں۔ اور طوائفوں کو شرفا کے مکانوں میں رسائی نہ ہوتی تھی۔ وہ شریف خواتین کی مجلسوں اور محفلوں میں قدم نہ رکھ سکتی تھیں۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس میں تغیر ہوتا گیا۔ اب خواتین بھی مجرے کو زیادہ پسند کرنے لگیں تھی۔ پردے کے باہر طوائفوں کے طبقے اور سارنگی ساز بیٹھا کرتے اور زمانہ مجلس میں پردہ کے اندر طوائفیں بیٹھ کر گاتی تھیں۔ حیدرآباد میں تعلیمی ترقی نے ساتھ ساتھ اخلاق لحاظ سے لوگ طرز معاشرت میں تبدیلی لانے لگے موسیقی ایک

فن لطیف ہے۔ فی زمانہ موسیقی کا سیکھنا اور اس کی باقاعدہ تعلیم دیجا رہی ہے۔ یہ ایک آرٹ ہے۔

قوالی : قوالی بھی فن موسیقی کی ایک صنف ہے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان سب سے پہلی بار قوالی امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ نے ایجاد کی ہے۔

قوالی گانے کا یہ طریقہ ہے کہ قوال ایک شعر گاتا ہے اور پھر اس شعر کے دوسرے مصرے کی تکرار کرتا ہے تو تین چار ساتھی ہم آواز ہو کر اسی ایک مصرے کو بار بار دہراتے ہیں۔ قوالی نعت کا ایک شعر ایک سے زائد شعر ترنم سے پیش کرنے کے بعد اس پر اپنی طرف سے گرہ لگانے میں کئی کئی اشعار کو دوسرے شعرا کے سناتا ہے۔ پھر جب آخری بند پر اپنی تان توڑتا ہے اگر قوال پڑھا لکھا ہو صحیح مخرج اور تلفظ کے ساتھ اور جب کلام عارفانہ ہو تو قوالی کے دوران صاحب حال لوگوں کو ایسا وجد طاری ہوتا ہے اور اس شدت سے رہتا ہے کہ وہ سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ اکثر ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ قوالی کے درمیان بھی کلام کی تاثیر انگریز سے صاحب سماع پر نہ صرف بے ہوشی طاری ہو گی، بلکہ روح پرواز کر تی۔

مصوری

مصوری کا فن بڑا قدیم ہے۔ پہلے پہل پتھر اور مٹی کے برتن پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور بھدے اشکال بنائے جاتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ ریاضی کی اشکال کی طرح آدمیوں اور جانوروں کی تصویریں بھی بنائی جانے لگیں۔ رنگ اور برش ایجاد ہوئے۔ تو تصاویر میں رنگ بھرے جانے لگے پھر پتھر تراش کے مجسمے اور بت تراش اور سنگ تراش کہلائے۔ تصاویر اور اور نقش و نگار بنانے والے مصور اور نقاش کے نام پکارے جانے لگے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ دنیا کا پہلا اسکول آف آرٹ، پہلا اسٹوڈیو اور پہلا نگار خانہ اورنگ آباد دکن ہی میں قائم ہوا۔ اس نگار خانے کا ہر مصور اپنی جگہ ایک آرٹ ڈائرکٹر تھا۔ اجنتہ کے غاروں کی رنگین مصوری اور ایلورہ کے غاروں کی مصوری دیکھنے کے لئے جاتے ہیں اور انھیں دیکھ بھی یہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ فن کار ابھی ابھی اپنا اپنا کام ختم کر کے گئے ہیں۔ اجنتہ کے غاروں میں سب سے اعلیٰ شاہکار جو ایک عورت کی تصویر ہے۔ اس تصویر سے ہمارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاتما بدھ کی بیوی کی شبیہ ہے عورتوں کی دوسری تصاویر کی نمایاں خصوصیات بھرا بدن۔ ابھرے ہوئے

کھوے۔ پتلی کمر۔ بھاری بھرکم چھاتیاں، ستوان ناک پتلے ہونٹ ہرن کی آنکھیں پتلی اور لانبی انگلیاں ہیں۔ جمالیاتی محاسن کے علاوہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تصاویر میں زندگی ہے۔ مصوری اور نقاشی کے یہ شاہکار صدیوں تک زمانے کے نظروں سے اوجھل رہے۔ ہند میں مصوری تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے شاہی نگارخانہ قائم کیا تھا۔ جب دہلی کے شاہی نگارخانے معطل کردیئے گئے تو وہاں کے فنکار ملک کے مختلف حصوں میں بکھر گئے تو چند مصور حیدرآباد آکر مقیم ہوگئے تھے۔ مغل مصوری کے نئے اسلوب کی بنیاد دکن میں ڈالی گئی۔ اسے دکن اسکول کہا جارہا ہے

میر عثمان علی خان کے عہد میں حیدرآباد دکن میں اسکول آف آرٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسے میں مجسمہ سازی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مشہور مصوروں میں عبدالقیوم، فضل اللہ اور محمد تراب بہت مشہور ہیں۔

خطاطی: فن خطاطی بہت قدیم فن ہے۔ حیدرآباد دکن میں اس فن کے جاننے والے بہت رہے ہیں۔ قطب شاہی دور میں فنون لطیفہ کو بہت ہوں اسی زمانے میں اچھے خطاط بھی یہاں جمع ہوگئے تھے۔ خطاط کو آصفجاہوں کی سرپرستی بھی ہیں۔ میر محبوب علی خاں آصف سادس کے عہد میں قرآن وغیرہ کی کتابت کے لئے اچھے اچھے خطاط اور خوشنویس دکن میں تھے۔ بہادرشاہ ظفر کے استاد حضرت حافظ سید امیر الدین روشن جنگ امیر الدولہ ، ضیاء الملک دہلی چھوڑکر دکن آگئے تھے۔ سفنی ضیا یار جنگ نے انھیں

محبوب علی خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ نوازش شاہانہ کی بدولت قدرت اللہ الحسینی فن خطاطی کے جوہر دکھانے لگے۔ میر عثمان علی خاں کے دور میں ان کو مسلم الثبوت خطاط کی حیثیت حاصل تھی۔ کرنسی نوٹ، کاغذ مہور، ٹکٹ، پوسٹ کارڈ لفافے کے ڈیزائن اور تحریروں وغیرہ سب انہی کے فن کے رہین منت ہیں۔

عدالت العالیہ، عثمانیہ تمائش گاہ شفاخانہ عثمانیہ، مسجد بلرغ عام خولہ صالحین مسجد جودی کے کتابت بھی قدرت اللہ انتخاب رقم کے ہی شاہکار امام الدین عتیق محمود نواز خاں، حشمت علی قادر، منتخب الدین نہریں پیرزادہ سید شاہ غلام محمود قادری بہت مشہور تھے۔

حیدرآباد کے کھیل

حیدرآباد کے مختلف کھیلوں میں جن میں میدانی کھیل متفرق کھیل اور لڑکیوں کے کھیل کو علحٰدہ علحٰدہ بیان کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں۔ پولو یا چوگان:۔ یہ کھیل دنیا میں اہم ترین کھیل کہلایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ نڈر لوگوں کا کھیل ہے سب میں پہلے سنہ ۱۸۷۵ء میں حیدرآباد میں نواب ماہر الدولہ کی سرپرستی میں کھیلا گیا تھا۔ پہلے پہل اس کھیل کی ٹیم گولکنڈہ میں سنہ ۱۸۸۶ء میں بنی اور سنہ ۱۹۱۰ء تک یہ ٹیم بڑے کرو فر کے ساتھ یہ ٹیم چوگان کھیلتی رہی۔ سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک حیدرآباد میں یہ کھیل بڑے زور شور اور دلچسپی سے کھیلا جاتا رہا۔ اور اس ٹیم نے انڈیا کی مختلف رجمنٹوں کی ٹیموں سے مقابلہ کیا تھا اس کھیل کے بہترین کھلاڑی شاہ مرزا بیگ تھے۔ سنہ ۱۹۵۴ء کے بعد حیدرآباد میں اس کھیل کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

کرکٹ: حیدرآباد دکن میں کرکٹ کا کھیل مقبول ترین کھیل سمجھا جاتا رہا ہے۔ امرائے مملکت اور کالج اور اسکول کے طالب علم اس کھیل میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ اس ضمن میں نواب معین الدولہ بہادر نے معین الدولہ گولڈ کپ کرکٹ ٹورنمنٹ کا انعقاد کیا تھا جو سکندرآباد کے پریڈ گراونڈ پر ہوا کرتے تھے۔

میاچ کے دوران قیام کھلاڑیوں کے رہائش کا انتظام بشیر باغ میں کیا جاتا تھا۔ کھیل کے کھلاڑیوں کو تفریحی مقامات پر لے جایا جاتا تھا۔ موسیقی کے محفلیں بھی ان کے لئے منعقد کی جاتی تھیں۔ ان میں فیقر شاہ سید محمد ہادی محمد حسین، غلام محمد اور آصف اقبال نامور کھلاڑی تھے۔

ہاکی: کرکٹ کی طرح ہاکی بھی مقبول کھیل تھا۔

ٹینس: بڑے اہتمام سے کھیلی جاتی تھی۔ مسٹر لس۔ یم ہادی اور کپتن محمد حسین بین الاقوامی شہرت والے کھلاڑی تھے۔ وائی ایم۔ سی۔ اے کلب نظام کلب اور باغ کے ٹینس کورٹ میں بہت مشہور تھے۔ باغ عام میں منعقد ہونے والے ٹینس کے مقابلوں کو دیکھنے کے لئے اعلیٰحضرت آصف سابع تشریف لے جاتے تھے۔

تیراکی: حیدرآباد میں تقریباً ہر بچہ تیراکی اور پیراکی کے فن سے واقف تھا اس شہر میں بے حساب تالاب اور کنٹے میں بچپن ہی سے لوگ اس فن میں کمال حاصل کر لیتے تھے۔ قصبوں اور گاؤں میں چھوٹے چھوٹے بچے جانگیا (چڈی) کر سے لکڑی، مدلا یا تنی (خشک کدو) باندھ کر کنٹوں میں بے دھڑک کود پڑتے۔ اور کچھ دن تک پانی میں ہاتھ پیر مارتے۔ غوطے کھاتے اور ڈبکیاں لگا لگا کر تیرنا سیکھ جاتے ہیں۔

گاڑوڑی کا کھیل: سپیرا۔ سانپوں کو پھنگی یا مس کر کر سانپوں کو بجانا تھا اور سانپوں کو سجا کر کچھ پیسے لوگ تماشا دیکھ کر دے دیتے تھے۔

کٹ پتلی کا کھیل: یہ کھیل بتلانے والی گروں پر آتی تھی۔ گڈیاں دی جاتے

باندھ کر نچاتی تھی۔

کبڈی: چھوٹے میدانوں یا بڑے آنگنوں میں۔ سات سات کھلاڑی حدِ مقابل میں کھڑے ہوتے ہیں۔ زمین پر لکیر بیچوں بیچ ایک لکیر کھینچتے ہیں۔ اس کو پیلی کہتے ہیں اور دو لکیریں دونوں بازوؤں کچھ فاصلے پر لکیریں کھینچتے ہیں سب کھلاڑی لائین میں کھڑے ہوتے۔ اب کوئی ایک کھلاڑی اس طرح لائین کو پار کرتے کرتے منہ سے مسلسل کبڈی کبڈی دم پکڑ کر دوسرے کھلاڑی کی طرف جا کر چھو آئے اور پیلی یہ دم توڑے تو ایک پائینٹ ہوتا ہے۔ یہ بڑا دلچسپ کھیل ہے اگر کھلاڑی پیلی سے دم پکڑ کر جائے اور دوسرے کھلاڑی اسکو پکڑ لیکر دم توڑے تو وہ یعنی اوٹ ہو جاتے ہیں۔ مقابل کے کھلاڑی اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کھلاڑی چھو کر واپس آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لائین کو پار کر کے دم بھرتے ہوئے واپس آجاتے اور کوئی اسے نہ پکڑ سکے یا وہ نہ گھٹے واپس آجائے تو نہیں ہوتے لیکن اسے نہیں دیا جاتا۔

ایک ٹیم کا توی اوٹ ہو جائے تو دوسرے ٹیم کا کھلاڑی دوبارہ گراونڈ میں جائے یہ کھیل کا وقت مقرر رہتا ہے اس درمیان ۴۵، ۴۵ منٹ کا کھیل رہتا ہے اور دس منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ جس کے پائینٹ زیادہ ہیں اس کی جیت ہوتی ہے۔ آخر میں کسی ٹیم کا ایک کھلاڑی بچ گیا اور اسے جائے تو بیس پائینٹ دیتے ہیں۔ آجکل لڑکیاں زیادہ اس کھیل میں حصہ لے رہی ہیں۔

جب وہ ہانپ ہانپ جائیں تو پھر کھیل ختم کر دیتیں۔ اس طرح ان کی ہلکی پھلکی جسمانی ورزش ہو جاتی۔

جھمک جھکا : یہ بھی ایک کھیل تھا جس میں دو لڑکیاں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوتی اور تالی بجا کر پہلے اچکتیں اور پھر اپنی ہتھیلیاں مقابل کی لڑکی ہتھیلیوں سے مس کرتی۔ اور یہ کلمات کہتی جاتی جھمک جھکا کٹوری بکرا

آنکھ مچولی :

اس کھیل میں عموماً ریفری کا اس طرح انتخاب کیا جاتا ہے ایک کھلاڑی دوسرے کھلاڑی کو سامنے کھڑا کر کے پہلے اپنے سینے پر ہاتھ مارتا اور پھر مقابل کے کھلاڑی کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتا ہے۔

ایک قلم دو قلم تینی چاری
جھمن بیٹا۔ دانہ دونا
کشتی بنتی بوغل

یا پھر

آبولال بالو لال۔ بالو کی ٹوپی لال
ہاتھ میں تلوار۔ مرغی کے انڈے بارہ گندے
کچا قورمہ پکا چور۔

فرداً فرداً تمام کھلاڑیوں کے ساتھ یہی عمل کر کے انھیں کھیل میں شریک کر لیا جاتا۔

اس کھیل کا آغاز تالی بجانے سے ہوتا ہر کھلاڑی اپنے دونوں ہاتھوں

ایک کھلاڑی کے اشارے پر چت یا پٹ کہہ کر اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مارتا۔ جو بچہ چت ہاتھ مارتا وہ گویا جیت کے الگ ہو جاتا اس طرح باری باری ہر بچے کے الگ ہونے کے بعد جو آخری کھلاڑی رہتا اسے چور بنایا جاتا۔ اور اسی کی دونوں آنکھوں پر دو ہاتھ رکھ کر کھیل ان کلمات پر شروع کیا جاتا کہ ؎

؎ آنکھ مچانی کرڑوا تیل۔ بلی یاد ے ولیل پچیل

بھیڑ و چھپ جا۔ سب بچے مختلف مقامات پر جا چھپتے ہیں۔ اور چور کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر ریفری کہتا ہے چھپنے والوں کو پکڑ لاؤ ۔ وہ دیوانہ وار ہر طرف بھاگ دوڑ کر کے ایک ایک کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جب اس کوشش میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ بڑے فخر اور خوشی کے ساتھ چلتا ہے جو چور بنتا ہے اُسے بھی یہی عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ دلچسپ کھیل آخر تک کھیلا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں تجسس کا مادہ ہوا ہو۔ اگرچہ ایک عرصہ سے ہر جگہ مندرجہ ذیل کھیل رائج ہیں جو بدیسی ہونے کے سبب سے ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

پولو۔ نٹ بال۔ کرکٹ۔ ہاکی، ٹینس، تیراکی، بیڈمنٹن، شٹل کاک، باکسٹ بال، جیس بال، جائنٹ بال، باکسنگ، سلنگ، ٹینی کائٹ، سائیکل پولو، کبڈی، تال بم، جھاؤ بند وغیرہ لٹو کھیلنا۔ گالیاں کھیلنا۔ غلیل، چھوکی بلا تیراکی کا دوسرا نام فن شناوری ہے۔

دکن میں تیراکی اور پیراکی کے فن میں بعض صاحب کمال لوگ (؟)۔

تالابوں اور کنوؤں کی کثرت کے باعث گاؤں اور شہر میں چھوٹے چھوٹے اور چھوٹے چھوٹے بچے کرسے خشک کدو یا مدلا (لکڑی) باندھ کر پانی میں بےدھڑک کودتے، ہاتھ پیر مارتے غوطے لگاتے دکھائی دیتے ہیں اکثر موسم گرما میں امراء اور جاگیردار اور عوام و خواص تالابوں کو تیرتے اور نہانے کے لئے جاتے دیکھتے تھے حیدرآباد میں ایک بہترین سوئمنگ پول بھی ہے جہاں بچوں کو تیرنے کی تربیت دی جاتی۔

شطرنج : دکن میں یہ کھیل سب کھیلوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ اس کھیل میں عقل و دانش اور فہم درکار ہوتی ہے۔ اکثر لوگ، اس کھیل کو منحوس سمجھتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہمارے گھرانے میں شطرنج بڑی شوق سے کھیلی جاتی ہے۔ یہ کھیل صرف دو آدمی کھیلتے ہیں۔ شطرنج کے تختے پر (۶۴) خانے ہوتے ہیں اور (۳۲) مہرے۔ اچھا کھیلنے والے کو شاطر کہتے ہیں وہ دونوں بازی کے تمام مہروں پر نظر رکھتا ہے اور رفتار حریف سے پہلے اپنی چال ذہن میں تجویز کرلیتا ہے۔

دکن میں شطرنج کا کھیل امیر و غریب سب ہی شوق سے کھیلتے تھے۔ یہ امرائے دل بہلائی کا مشغلہ بھی تھا۔ اچھا کھیلنے والوں کے درمیان مقابلہ بھی ہوا کرتے تھے۔ ہر پیشے اور ہر عمر کے لوگ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ نواب ضیاء یار جنگ، اس کھیل کے ماہر تھے۔ غالباً نہ بھی کھیلتے تھے۔ گھوڑا اٹھا کر کھیلتے۔

شکار، گھوڑ دوڑ، کشتی اور پہلوانی اور پنجہ کشی وغیرہ سے عام طور پر دکن کے کھیل کود سے تعلق رکھتے ہیں۔

حیدرآباد کے تقریباً ہر گھرانے میں گڑیوں کی شادی کے بیاہ کا کھیل عام
طور پر رائج تھا۔ رشتہ دار نا کتخدا سہیلیاں عموماً گڑیاں اس طرح کھیلتی
تھیں کہ ایک لڑکی گڈے کی فرضی ماں بن جاتی اور دوسری لڑکی گڑیا کی
ماں کا پارٹ ادا کرتی۔ جب ان دونوں گڑیوں کا رشتہ کرنا ہوتا تو یا
تو کپڑے کی ٹکڑے کی گڑیا اور گڈا (پاٹ پٹوٹی گڑیاں) بنا کر یا علیٰنی
اور کافور کی گڑیوں کو زرق برق لباس پہنایا جاتا اور پوتھ اور موتی
کے زیورات تیار کر کے ان کے زیب تن کئے جاتے تھے۔ ایک ہی گھر میں
ایک کمرے میں گڈے کو اور دوسرے کمرے میں گڑیا کو دو، دو بالشت کے
نواڑ کے پلنگ پر پیلی چادریں بچھا کے دو ایک دن مانجھے بٹھایا جاتا تھا
جب کے گھر کی عورتیں ان گڑیوں کی گل پوشی کے وقت سر جوڑ کے بیٹھتیں
ڈھول پر مختلف گیت گا گا کے خوش ہوتیں۔ اسی طرح ان کی ساچق
مہندی کی رسم انجام پاتی اور فرضی قاضی اپنی فیس وصول کر کے اناپ
شناپ قسم کے دو بول پڑھ دیتا اس طرح گڑیوں کا نکاح ہو جاتا۔ اور
مہمانوں کی ضیافت کے بعد رخصتی باجے اور بارات اور ضروری جہیز کے ساتھ
کی جاتی۔ دراصل یہ ایک طرح کا ٹوٹکا سمجھا جاتا تھا تاکہ فرضی سمدھیوں
کی شادی جلد ہو جائے ان کے علاوہ ان سمدھیوں کی باہمی محبت اور
بڑھ جاتی۔ اس کھیل میں بچوں کو باہمی رواداری کے ساتھ ساتھ کھانا
پکانے۔ کپڑوں کی سلائی کرنے اور گھر کی سجاوٹ کرنے کی مستقل تربیت
دی جاتی تھی۔ اور وہ ہر کام بڑی دلچسپی اور دلی شوق کے ساتھ کرتے تھے۔

ہنڈ کلھیا: گڑیا اور گڈے کی شادی سے پہلے دکن میں ہنڈ کلھیا کھیلنے کا رواج عام تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ لڑکیوں کو مصروف رکھا جائے۔ چنانچہ شروع شروع انھیں چاولوں سے دھان اور ایک ایک کنکر جدا کرنیکی ترغیب دی جاتی تھی۔ اسی طرح تھوڑے سے چاولوں میں میٹھی دو میٹھی مسور کی دال ملا دی جاتی اور انھیں الگ کرنے کے لئے مامور کیا جاتا۔ رفتہ رفتہ کھانا پکانے اس طرح ترغیب دی جاتی کہ ہفتہ وار چھٹی کے دن چھوٹی چھوٹی ہانڈیوں میں کھانا، روٹی، دال وغیرہ پکانے بگھارنے کے طریقے سکھائے جاتے یہ کھانے اور پورن پوری جیسی میٹھی چیز بھلے برے طریقے سے پکا کر لڑکیاں چھوٹا سا دستر خوان چنتیں اور اپنے بزرگوں کے ساتھ ہم طعام ہوکر خوشیاں مناتی تھیں۔ اگر کھانا ذائقہ دار پکتا تو اپنے بڑوں سے اس کا کچھ صلا بھی پاتیں۔

ایڑی کی تیڑی: تین سال سے پانچ سات سال کی عمر کی بچیاں یہ کھیل اس طرح کھیلتی تھیں کہ ایک بچی اپنا دہانہ ہاتھ زمین پر ٹیک دیتی اور دوسری بچیاں ایک کے بعد دیگرے دوسری بچی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتیں اور سب سے آخر میں ایک بچی ان ہاتھوں کے اوپر اپنا بایاں ہاتھ کے دہانے ہاتھ کو چت پٹ کے طور پر یہ کہتے ہوئے تھپتھپاتی تھیں۔

ایڈی کی تیڑی جو تھی کے پان ؛ پکڑو حمانی جوگی کے کان نیل

پلہ پلہ کھچڑی پلہ پلہ تیل ؛ کھیل بڈھی کھیل تیری ہٹیوں میں نون

اس طرح یکے بعد دیگرے ہر لڑکی اپنے دونوں ہاتھ آدھ منٹ کے لئے اپنی بغلوں میں رکھ کر کسی سہیلی کے دونوں کانوں پر جما دیتی ہیں۔ اگر ہاتھ گرم

ہوئے تو ہنہا ورنہ وہ سہیلی اسے خوب گدگداتی اسی طرح سب بچوں میں ہنسی کا گول گپا شروع ہو جاتے۔

یہ ننھے منے بچوں کا کھیل تھا۔ جس میں ہر دوسرا بچہ اسی طرح پہلے بچہ کے انگوٹھے کو اپنی مٹھی کی گرفت لے لیتا۔ جب یہ مٹھیاں اس طرح بالشت دو بالشت اونچی ہو جاتیں تو ایک بچہ یا بچی سب سے اوپر کی مٹھی کا انگوٹھا پکڑ کر ہلاتی ہوئی کہتی۔

۵ "جھاڑ جھاڑ کون ہلاتے"

اس کے ساتھیوں سے جواب ملتا۔ بادشاہ کی بیٹی"۔

پھر سوال کیا جاتا "کیا مانگتی ؟"

جواب میں کسی پھل کا نام لیا جاتا۔

سوال والی لڑکی ہر مٹھی کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتی "یہ کچا۔ یہ پکا۔ اگر آخری مٹھی پکا پر ختم ہو تو جیت سمجھی جاتی اور وہ اپنی مٹھی ہٹا کر الگ تھلگ اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے بیٹھ رہتی۔ اگر کسی کی مٹھی پہ کچا کے لفظ پر ہٹائی جائے تو وہ بھی اسی طرح الگ بیٹھ رہتی۔ حتی کہ سب کی سب الگ تھلگ ہو کر اپنی بغلوں سے ہاتھ جدا کر کے پہلی بچی کے گالوں کو چھو لیتی اگر ہاتھوں میں گرمی محسوس ہو ٹھیک ورنہ سب بچیاں اسے بنانے لگتیں اور آپس میں ایک دوسرے کے گدگدیاں کر کے ہنستی ہنساتیں۔

. بھائی بتو : اسی طرح بھائی بتو کا کھیل بھی رائج تھا جس کا یہ طریقہ تھا کہ چند بچیاں اپنے اپنے دونوں پاؤں ایک سیدھ میں ملبے کر کے ایک

دوسرے کے پہلو میں ایک ہی صف میں بیٹھ جاتیں۔ ایک بچی ان کے مقابل ہو بیٹھتی اور مقابل کی بچیوں کے زانوں کو چھوتے ہوئے یہ کہتی۔

بھائی بتو بھائی بتو تم جاتے کتی دور چھے مہینے کا رستہ بتیا۔ ندی آئی بھر پور گھوڑے تیرینگے ہاتھیاں ڈوبیں گے۔

شیشبالو کے جھاڑ کے نیچے جبشی مر دینگے۔

جبشی میرا بھائی۔ چار کونی چھائی

جنگل جنگل جہندی بیسی بھائی کا پاؤں لال

اس گیت کا آخری لفظ جس پیر پر بولا جاتا۔ وہ بچی اپنا وہ پیر کھینچ لیتی۔

اس گیت کا اعادہ اس وقت تک جاری رہتا جب ایک ایک کرکے ہر بچی ہٹ نہ جائے۔ اس کھیل کا مقصد یہ ہے کہ کم عمر بچوں اور خاص کر بچیوں میں صبر و تحمل کا مادہ راسخ ہوتا جائے۔

ہا پھو ہریا پھو: بعض بالغ اور نابالغ لڑکیاں آپس میں اس طرح کھیلتی تھیں کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی قینچی بنالیتیں اور دوسری لڑکی کے ہاتھ کی قینچی میں اپنے دونوں ہاتھ دے دیتیں اور دونوں ملکر ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوط پکڑے اس طرح تیزی سے چکر کاٹتیں کہ انکی جوتیاں نمایاں طور پر ہلنے لگتیں اور ان کی زبان پر یہ کلمات جاری رہتے۔ ہا پھو ہریا پھو۔

کو بڑھاتے ہیں۔ لوگوں کی کثرت کے سبب سے نمائش گاہ ایک تفریح گاہ بن جاتی ہے۔ اور کھیل تماشوں کے مقامات اپنے کرتب دکھایا کرتے ہیں۔ عورتوں کے لئے مہینے میں چار یا پانچ مخصوص دن مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ جبکہ مردوں کا داخلہ نمائش گاہ میں نہیں ہوتا۔

چونکہ مصنوعات ملکی کا ہماری مشرقی تہذیب سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لیے یہ سالانہ نمائش ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک جزو بن گئی ہے۔

اعراس اور میلے

اعراس کی مشترکہ کیفیت

حیدرآباد میں لوگ (ہندو اور مسلم) بڑی عقیدت اور پاکیزگی کے ساتھ اعراس میں شرکت کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں عرس کے دن جیسے جیسے قریب آنے لگتے تو معتقدین عرس میں شرکت کی تیاری کرتے تھے۔ سجادہ نشین عرس کی تیاری کے لئے مریدوں سے چندہ وصول کرتے اور درگاہ اور اس کے آس پاس کی عمارات کو چونا پڑتا۔ رنگ آمیزی کی جاتی۔ دو تین روز پہلے ہی اطراف و اکناف چھوٹی چھوٹی چنے، مٹھائی، کباب، چاکنا، روٹی، کلچے، تِل مرچیاں جیسے اور پاپڑ کی دوکانیں کھیل تماشے کرنے والے آجاتے، دوست احباب کے ساتھ لوگ جوق در جوق لوگ درگاہ پر چلے آتے۔ قہقہے، فقرہ بازیاں اور مذاق شروع ہوتا۔ موسیقار اور قوال حاضر ہو جاتے، صبح شام دستر خوان ہوتے۔ لوگ جب درگاہ پر فاتحہ سے، صندل، سماع مرشد حاضری دیتے تو غسل کرکے خاندانی طریقت کا شملہ یا ٹرہ پہن کر ہاتھ میں تسبیح لے کر درود شریف پڑھتے رہتے۔ صندل جلوس میں صندل کی کشتیاں کارچوبی شامیانے کے نیچے ہوتیں۔ مولود کی جماعتیں۔ شائقین اور کرام کے ساتھ آتا تھا۔ مزار سے پُرانا غلاف اتار کر اس پر صندل ملا جاتا کمخواب

یا اطلس کا نیا غلاف چڑھایا جاتا۔ پھولوں کی چادریں ڈالی جاتیں فاتحہ، مولود اور قوالی ہوتی اور قوالی بھی کئی کئی دن تک جاری رہتیں۔ صندل کے دوسرے دن چراغاں ہوتے۔ ختم قرآن کرایا جاتا اور سب کو کھانا کھلایا جاتا۔

حیدرآباد میں چونکہ پہلے برقی روشنی کا انتظام نہیں تھا اسلئے پنتھوں اور گلاس سے روشنی کی جاتی تھی۔ بلوری جھاڑ لنترھا نڈی اور فانوس میں موم بتی جلائی جاتی تھی۔

بڑے بڑے عرسوں میں خوب دھوم دھام اور چہل پہل رہتی تھی۔ لوگ درگاہوں پر پھینکے، جھولے، چادریں چڑھاتے، درخواست باندھتے۔ منتیں اور مرادیں ہوتیں۔ ہر رنگ کے لوگ آموجود ہوتے۔ بعض لوگ عقیدت سے ہٹ کر بھی سیر تماشے کی غرض سے عورتیں بھی اعراس میں شرکت کرتیں۔

بعض اعراس میں سرکاری انتظامات ہوتے ہیں اور بعض تو سجادے صاحب کی انتظامی کارروائی بعد اعراس پہلے وغیرہ ہوتے ہیں۔

جو عرس بہت بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں۔ ان میں پہاڑی شریف پر حضرت بابا شرف الدین صاحب، یوسف صاحب شریف صاحبؒ اور حضرت جہانگیر پیراں کا عرس ہے جہاں پر مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

حیدرآباد کے مشاعرے

شروع شروع مہاراجہ چندولال شاداںؔ کی دیوڑھی میں خاص شعری محفلیں منعقد کی جاتی تھیں۔ بعد کو ان کے نواسے مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ سابق مدارالمہام حکومت آصفیہ نے اپنے فطری ذوق کی بنا پر باقاعدہ مشاعروں کی داغ بیل ڈالی مہینے میں ایک یا دو بار اپنے یہاں طرحی اور غیر طرحی مشاعرے منعقد کرتے تھے مصرع ہائے طرح فارسی اور اردو میں دیئے جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں عموماً مندرجہ ذیل شعرائے کرام شریک ہو کر اپنے کلام سے حاضرین کو مستفیض کیا کرتے تھے۔

استاد شاہ آغا شوستری، راجہ گردھاری پرشاد باقی مولوی عبدالعلی والہ عبدالجبار آصفی، ترک علیشاہ ترک، غلام قادر گرامی، ضیا یار جنگ ضیاؔ، غلام مصطفٰے رسا، فصاحت جنگ جلیلؔ، اختر یار جنگ اخترؔ، حیدر یار جنگ نظم طباطبائی تراب یار جنگ سعید، جوشؔ، فانیؔ۔ ضامن کنتوری ماہر القادری حکیم آزاد انصاری، حیرت بدایونی، پنڈت سورج بھان تھانوی میکش، کاظم علی باغ عابد مرزا بیگم، طلعت یزدوی، مسعود علی محوی، راجہ نرسنگ راج عالی، محبوب راج محبوب، نواب لطف الدولہ لطف، عبداللہ خاں کامل، مہدی حسین آلم، امین الحسن بسمل، نادر علی برتر، آفتاب علی خاں قہر،

ان مشاعروں کے سلسلہ مہاراجہ کرشن پرشاد کے مدارالمہام ہونے تک جاری رہا۔ اس کے بعد مہاراجہ کی معروفیت بڑھ جانے سے یہ مشاعرے متاثر

ہو گئے۔ اسی طرح جلیل منزل میں فصاحت جنگ جلیل کے یہاں بھی خاص خاص مشاعرے ہوا کرتے تھے نظام کالج کے مشاعرے آفتاب علی خاں مہر کے زیر اہتمام مہاراجہ شاد کی صدارت میں باقاعدگی کے ساتھ منعقد کئے جاتے تھے۔ تراب یار جنگ سعید بھی اپنے یہاں مخصوص شعری محفلیں منعقد کرتے تھے۔ کاظم علی باغ کے مکان واقع چیلی بازار میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

حسینی علم میں نرسنگ لاج عالی کی ڈیوڑھی میں بھی مہاراجہ شاد کی صدارت میں سالانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس طرح حیدرآباد میں شعری ذوق پروان چڑھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محرم اور صفر کے مہینوں میں نواب تہوار جنگ اور نواب ماہر الدولہ اپنے یہاں لکھنؤ سے مشہور اور معروف مرثیہ گو شاعروں کو مدعو کرکے روزآنہ مجلس میں ان سے مرثیے پڑھواتے تھے۔ چنانچہ آسمان مرثیہ گوئی کے آفتاب تاباں میر ببر علی انیس تہور جنگ کی دعوت پر حیدرآباد آئے اور محرم کا پورا دہا مرثیے سناتے رہے۔ بہرالدولہ کے شادی خانے کے علاقے سالار جنگ میں پیارے صاحب رشید کے علاوہ کئی مشہور شعرا ہر سال ماہ صفر میں حیدرآباد آکے اپنے مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ رشید صاحب کو سننے کے لئے نواب میر محبوب علی خاں آصف بہ نفس نفیس شادی خانہ میں تشریف لاتے تھے اور رشید صاحب کی خواہش پر اپنا سلام بھی ان سے پڑھواتے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو کے گھر گولڈن تھریشس ہولڈ پر بھی مخصوص شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں گنے چنے شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔

سے "سلطان دکن آندسلطان الشعرا" معظم جاہ شجیع کی صدارت

ہی میں جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے سلسلہ میں ایک شاندار غیر طرحی مشاعرہ منعقد کیا
گیا تھا جس میں تسلیمات اکبر آبادی، شور ناگپوری، فانی بدایونی، نواب
قدرت نواز جنگ شہید یار جنگ شہید اور یونیورسٹی اسٹاف اور خلیفہ
عبدالحکیم اور ایک دو طلبا اس طرح بدلس کو شامل کرکے گیارہ شاعروں کا کلام
پیش کیا گیا۔ جس میں کسی کو داد دینے کی اجازت نہیں تھی۔

اس کے بعد مولانا حمید الدین قمر فاروقی صدر جمعیت علماء کے ادارہ ترقیہ
میں سال میں ایک دو یادگار مشاعرے منعقد ہوتے رہے جن کی صدارت عموماً
جگر مرادآبادی نے کی اور ایک مرتبہ حسرت موہانی نے۔ ان کے علاوہ فانی
بدایونی پروفیسر سراج الدین شمیم وغیرہ نے کی۔ ان مشاعروں میں کہنہ مشق
غزل گوؤں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے نظم گو شعرا مخدوم محی الدین بھی شریک
ہوتے تھے۔

آجکل صفی سوسائٹی اور مختلف ادبی انجمنوں کے ادبی مشاعرے جاری ہیں
ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کا سالانہ مشاعرہ بڑے اہتمام سے نمائش کلب حیدرآباد
میں منعقد کیا جاتا ہے جس میں کثیر تعداد میں مقامی شعرائے کے علاوہ بیرونی مہمان
شعرا بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ہزاروں سامعین شریک
ہوتے ہیں اور آدھی رات تک صبر و سکون کے ساتھ شعرا کی تخلیقات سے
محفوظ ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ زندہ دلان حیدرآباد کا مشاعرہ بھی ہر سال ترتیب
دیا جاتا ہے اور اس میں بھی مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی مزاح نگار شعراء

حصہ لیتے ہیں۔

آداب مشاعرہ: فرش پر سب شعراء حلقہ کی شکل میں بیٹھتے۔ قاعدہ تھا کہ نئے اور نوجوان شعراء کو پہلے شعر کہنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ بعد میں بڑے اور بزرگ شعراء اپنا کلام سناتے تھے شمع جس کے سامنے پیش کی جاتی۔ باری باری اپنا کلام سناتے اور واہ واہ سے داد حاصل کر لیتے تھے۔

آداب محفل:

کسی مجلس یا آپسی ملاقات پر حیدرآبادی لوگ (آداب عرض ہے کہتے ہیں۔ جو یہاں کا مشترکہ سلام ہے۔
اچھا اب آپ کو ہمارا آداب۔!

فہرست کتابیات ماخذات

نام کتاب	مصنف
۱)۔ تذکرہ معاشرت حیدرآباد	ابوظفر موئیدالدین حسن
۲)۔ مملکت آصفیہ جلد اول، دوم	محمد عبدالحی
۳)۔ تاریخ نوائط	عزیز جنگ ولا
۴)۔ عہد عثمانی	یوسف حسین خان
۵)۔ عصر جدید	جانکی پرشاد
۶)۔ انڈین میرج ایکٹ	۱۹۸۲
۷) مہاراجہ چندولال شاداں	ڈاکٹر سمینہ شوکت
۸) دکنی کلچر	پروفیسر ہارون خان شیروانی
۹)۔ رسوم دہلی	مولوی سید احمد دہلوی
۱۰)۔ پاؤں میز کی رسم سے لیکر جمعگیوں تک	حسن سعید
۱۱)۔ حیدرآباد فرخندہ بنیاد	ڈاکٹر زور
۱۲) فخر محمد قلی قطب شاہ	〃 〃
۱۳)۔ شہر حیدرآباد	مطبوعہ روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن (منتخب مضامین)
۱۴)۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ	سلطان محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد
۱۵)۔ مقدمہ تاریخ دکن	عبدالمجید صدیقی

۱۶)۔ آندھرا پردیش	یم باگاریڈی
۱۷)۔ نظام الملک آصفجاہ اول	مراد علی طالع
۱۸)۔ بستان آصفیہ	مانک راؤ وٹھل راؤ
۱۹)۔ حیدرآباد کا شاہی دسترخوان	نسیم صمدانی
۲۰) نفیس دسترخوان	زہرہ جبین
۲۱)۔ مہاراجہ کرشن پرشاد شاد	ڈاکٹر حبیب ضیا
۲۲)۔ حیدرآباد کی مشہور عبادت گاہیں	سررشتہ معلومات سرکار عالی حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ف
۲۳)۔ روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین صاحب
رہنمائے حیدرآباد	۱۹۳۷ء جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
سب رس دکنی نمبر	ادارہ ادبیات اردو
سلطان محمد تغلق کے دور حکومت کی تقریبیں۔	نصیر الدین ہاشمی
خواتین عہد عثمانی	" "
عہد عثمانی میں اردو خدمات	صاحبزادہ میر احمد الدین علی خاں

۱۲۸۰

۷۸۶
۹۲

قطعۂ تاریخ

طبع کتاب "حیدر آباد کی مشترکہ تہذیب"

از

عزیزم اقبال جہاں سلمہا

مستحق آفریں ہیں آپ اقبال جہاں
کس قدر محنت اٹھا کر آپ نے لکھی کتاب
لو مبارک ہو اشاعت سال صاحبؔ نے کہا
یہ ہے تہذیب دکن پر کیا ہی اچھی سی کتاب

۱۹۸۵ء

نتیجۂ فکر: سید مظفر الدین خاں
صاحبؔ حیدر آبادی